مصنف

میکاولی

مترجم

ڈاکٹر محمود حسین
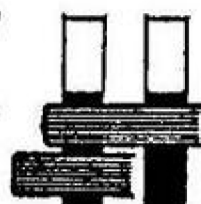
پبلشرز نوٹ

بادشاہ میکاولی کی شہرہ آفاق کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین نے کیا ہے۔ میکاولی کی اس کتاب کو دنیا کی کلاسیک کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس کا پہلا اردو ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر اس وقت پاکستان میں یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی اس لئے فکشن ہاؤس نے سلیقہ کے ساتھ پہلا کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

زیر نظر کتاب فکشن ہاؤس کے اشاعتی پروگرام کلاسیک سیریز کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید ہے کہ اردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ہم نے اردو قارئین کے لئے دنیا کی شہرہ آفاق کتابوں کے تراجم شائع کئے ہیں اور اب ہم ایسی کتابیں شائع کر رہے ہیں جو دنیا میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں' حال ہی میں افلاطون کی "ریاست" شائع کی ہے جس کا ترجمہ برصغیر کے ممتاز سکالرز ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا ہے۔ فکشن ہاؤس پاکستانی معاشرے کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک کئی ادبی شاہکار تاریخ' سوانح' سماجیات' سیاسیات' سیاحت اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو قارئین ہماری اس نئی کتاب کو پسند فرمائیں گے۔

قارئین کی طرف سے تعمیری تنقید ہمارے لئے رہنمائی کا کردار ادا کرے گی۔

ظہور احمد خان

دیباچہ

(طبع دوم)

اس کتاب کا ترجمہ جیسا کہ دیباچہ طبع اول سے ظاہر ہوتا ہے میں نے آج سے چھ سال پہلے کیا تھا۔ کتاب ۱۹۴۷ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ چند ہی جلدیں فروخت ہوئی تھیں کہ دہلی میں وہ خونی سیلاب آیا جس نے مسلمانوں کو نہ صرف جانی و مالی بربادی کی بلکہ ان کی تہذیب کو بھی ملیا میٹ کرنے کا بندوبست کیا۔ اردو زبان اغیار کی نگاہوں میں اس وجہ سے خاص طور پر کھٹکتی تھی کہ وہ انہیں مسلمانوں کی تہذیب کی عظمت کی یاد دلاتی تھی۔ چنانچہ اردو کے دو اہم ذخیروں انجمن ترقی اردو اور مکتبہ جامعہ۔ دونوں پر وار کیا گیا۔ مکتبہ کی جو کتابیں جل کر راکھ کا ڈھیر بنیں ان میں "بادشاہ" کی جلدیں بھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو یہ علم ہی نہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں موجود ہے۔ تقریظیں تک نہ نکل پائیں کہ مترجم کو کم از کم ترجمہ کے نقائص کا تو پتہ چلتا۔ بہرحال طبع دوم کے لئے میں نے باوجود اور مصروفیتوں اور وقت کی قلت کے کتاب پر نظر ثانی کی ہے۔ کوشش تو یہی رہی کہ ترجمہ صحیح بھی ہو اور بامحاورہ بھی۔ اس مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔

محمود حسین

کراچی

دیباچہ

(طبع اول)

نکولو میکاولی کی کتاب II Principe جس کا ترجمہ اردو میں پیش کیا جارہا ہے۔ علم سیاسیات کی نہایت اہم کتابوں میں سے ہے۔ فلسفہ سیاسیات کی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہی اسی سے ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں ممالک متحدہ امریکہ میں میکاولی کی تمام تصانیف چار جلدوں میں ترجمہ کرکے شائع کی گئیں۔ مترجم کا نام ڈٹ نولڈ ہے ۱۸۹۱ء میں برڈ نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے میکاولی کے "بادشاہ" کو نہایت ہی مفید حواشی لکھ کر شائع کیا۔ انگریزی ترجموں میں تھامسن اور میریٹ کے ترجمے خاص طور پر اچھے ہیں۔ ان ترجموں کے اور بعض جرمن ترجموں کو سامنے رکھ کر میں نے کتاب کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ مقدمہ اور حواشی کی تیاری میں میکاولی کی دوسری تصانیف کے علاوہ اور بہت سی کتابوں سے مدد ملی۔

پروفیسر ولاری کی کتاب جو پہلے اطالوی زبان میں شائع ہوئی اور جس کا بعد میں انگریزی میں Life and Times of Machiavelli کے نام سے ترجمہ ہوا ایک ایسی تصنیف ہے جس کے بغیر میکاولی پر قلم اٹھانا مشکل ہے جرمن زبان میں اس

موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ نئی تصانیف میں مائینکے کی کتاب Die idcc der Staatsrason خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ برڈ کے ایڈیشن میں لارڈ ایکٹن کے مقدمے کی بھی خاص اہمیت ہے۔ میکاولی کو سمجھنے کے لیے فلسفہ سیاسیات کی عام تاریخوں کے علاوہ مندرجہ ذیل انگریزی کتابیں مفید ہوں گی۔

Macaulay, Critical and Historical Essays

Robertson, Machiavelli

Greenwood, Cosmopolis

Hiarnshaw, The Social and Polotical Ideas Great Thinkers of the Renaissance and the Reformation.

Allen, A History of Political thoughts in the sixteeth Century

Praz' Machiavelli and the Elizabethans.

محمود حسین

مقدمہ

نکولو میکاولی اب سے کوئی پانچ سو برس پہلے ۳ مئی ۱۴۶۹ء کو اطالیہ کے مشہور شہرفلورنس میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام برناروودی نکولو مکیاولی تھا۔ باپ خاصا کامیاب وکیل تھا۔ بہت دولت مند نہ سہی' عالی خاندان تھا۔ نکولو کی ماں بھی شریف گھرانے سے تھی۔ نکولو اپنے ماں باپ کا منجھلا بیٹا تھا۔

میکاولی کے بچپن کے بارے میں معلومات بہت محدود ہیں مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ ریاست فلورنس کا وہ عروج کا زمانہ تھا۔ لورنزد بر سراقتدار تھا۔ اس کی حکومت کے زمانے میں فلورنس کی شہرت کو چار چاند لگے۔ "تاریخ فلورنس" میں میکاولی نے ان نوجوانوں کا نقشہ کچھ اچھے الفاظ میں نہیں کھینچا ہے جو عالم نوجوانی میں اس کے ہم مشرب اور لنگوٹیا یار تھے۔

میکاولی کی عملی زندگی خاندان میدیچی کی حکومت کے خاتمے کے بعد شروع ہوئی ہے۔ ۱۴۹۴ء میں میدیچی حکومت ختم ہوئی اور فلورنس میں جمہوری نظام قائم ہوا یہ جمہوری دور ۱۵۱۲ء تک جاری رہا۔ ۱۴۹۸ء میں پہلی دفعہ میکاولی کو سرکاری ملازمت ملی۔ کچھ دنوں وہ صیغہ عدالت میں محرر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا رہا۔ پھر ۱۴۹۹ء میں مجلس دہ سری کا (جس کے ذمے خارجی سیاست تھی) معتمد مقرر ہوا۔ یہ ایک اہم عہدہ تھا۔ اور معتمد کی حیثیت سے وہ کئی حکومتوں کے ساتھ گفت و شنید کے

لئے بھیجا گیا۔ اس طرح بیرونی ممالک کی سیاست کے مطالعے کا بھی اسے موقع ملا اور دوسری اطالوی ریاستوں کے حالات کو دیکھنے بھالنے کا بھی۔

۱۵۰۰ء میں اس نے فرانس کا سفر اختیار کیا' لوئیز دوازدہم سے پسیا کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا صلہ حاصل کرنا مقصود تھا۔ اس بادشاہ کا ذکر میکاولؔی کی کتاب "بادشاہ" میں کئی جگہ آیا ہے۔ ۱۵۰۲ء میں میکاولی سیزر بورژیا کے پاس بھیجا گیا۔ میکاولی کی سیاسی زندگی میں اس واقعہ کی اہمیت ہے جب وہ پاپائے روما الگزانڈر اور اس کے بیٹے سیزر بورژیا کے پاس سفارت لے کر گیا ہے۔ اس وقت وہ فرانسیسی اور پاپائی فوجوں کی مدد سے روماناا ور سرحدی علاقے کو اپنے ماتحت لاکر متحد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے جسے میکاولی کا چشم دید واقعہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جب کرائے کی فوجوں کے چار سردار بورژیا کا ساتھ چھوڑ گئے تو پہلے تو بورژیا نے جھوٹے سچے وعدے کر کے انہیں اپنے یہاں بلایا اور جب وہ اس کے چنگل میں پھنس گئے تو انہیں ہڑپ کر گیا۔ بہرحال میکاولی پر بورژیا کی شخصیت کا گہرا اثر ہوا اور "بادشاہ" میں اس نے غالباً "بورژیا ہی کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے میکاولی اس کے ہر اس فعل کو سراہتا ہے یا اس کی ہر ادا کا ولدادہ ہے۔ "بادشاہ" میں بورژیا کو اس شخص کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس کا عروج اور زوال دوسروں کے عروج و زوال سے وابستہ ہو' جس کا ہر فعل عاقلوں اور داناؤں جیسا ہو اور پھر بھی وہی ایک راستہ اختیار نہ کر سکے جس میں اس کی نجات پنہاں ہوں۔ جو ہر امکانی خطرے کا پہلے سے کاٹ کر سکے' سوائے اس خطرے کو جو پیش آنے والا ہو اور جب اس کی ساری قابلیت کے باوجود اس کا بیڑا پار نہ ہو پائے تو وہ یوں پکار اٹھے کہ اس کی ناکامی میں اس کی اپنی ذمہ داری کو نہیں کسی ناگہانی آفت کو دخل ہے۔

جب ۱۵۵۳ء میں پائیس سوم کا انتقال ہوا تو میکاولی کو رومہ اس غرض سے بھیجا گیا کہ یورپ کے انتخاب کے موقع پر ہوا کا رخ دیکھے۔ یہاں پر اس نے بورژیا کو زبردست دھوکا کھاتے دیکھا۔ جولیس دوم کا پوپ کی حیثیت سے منتخب ہونا بورژیا کے لئے بہت ہی برا تھا۔ بورژیا کا یہ خیال کہ نئی مہربانیاں پرانی جفاؤں کو بھلا دیتی ہیں سراسر غلط تھا۔ جولیس نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک سیزر بورژیا کو تباہ نہ کر ڈالا۔

پھر ۱۵۰۶ء میں میکاولی جولیس دوم کے پاس فلورنس کی حکومت کا نامہ و پیام لے کر گیا۔ میکاولی پہنچا ہے تو جولیس نے بولونا پر دھاوا بولا ہی تھا جس میں اسے پوری کامیابی ہوئی۔ اسی طرح اور بھی بہت سی مہموں میں اسے فتح نصیب ہوئی۔ جولیس کی کامیابی کا راز اس کی تیزی تندی اور اس کی پرجوش طبیعت تھی۔ چنانچہ جہاں میکاولی قسمت اور عورت میں مناسبت بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ شجاع انسان نہ کہ ڈرپوک لوگ۔ ان دونوں کو قابو میں لاسکتے ہیں وہاں میکاولی دراصل جولیس دوم کی زندگی سے اخلاقی نتیجہ اخذ کر رہا ہے۔

اسی طرح میکاولی نے اور بھی کئی سفر کئے جن میں جرمنی کا سفر شامل ہے۔ ان سفارتوں سے میکاولی نے بہت کچھ سیکھا اور بعد میں اپنی تصانیف میں پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جس وقت تک جمہوری حکومت قائم رہی۔ میکاولی کو فلورنس کی سیاست میں خاصی اہمیت حاصل رہی۔ میکاولی کی ملازمت کا سلسلہ ۱۵۱۲ء تک جاری رہا۔ ۱۵۱۲ء میں جمہوریت کا خاتمہ ہوا اور ہسپانیوں کی مدد سے مدیچی پھر فلورنس کے مالک بنے۔ میدیچی آئے تو نہ صرف میکاولی کی ملازمت گئی۔ اسے چند ہفتہ تک قید بھی بھگتنا پڑی۔ رہائی ہوئی تو میکاولی نے عملی سیاست کو خیرباد کہا۔

میکاولی اکثر اسی مسئلہ پر غور کیا کرتا تھا کہ انسانی معاملات میں خود انسان کا کیا ہاتھ ہے اور قسمت کو کتنا دخل ہے۔ یہ خیال کہ قسمت ہی پر انسانی ترقی اور عروج کا انحصار ہے۔ میکاولی کو ذرا نہ بھاتا تھا لیکن اسے یہ بات بھی صاف نظر آتی تھی کہ بڑے سے بڑا سورما دنیا میں ذرا بھی نام پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر قسمت اس کا ساتھ نہ دے اور وہ گھڑی نہ آن پہنچے جب کہ وہ اپنے ہنر کو ظاہر کر سکے اس مقولہ کی صحت خود میکاولی کی زندگی سے بھی عیاں ہے۔ اگر میدیچی کی واپسی کے بعد میکاولی کو عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار نہ کرنی پڑتی تو دنیا اس کی تصانیف سے محروم رہتی۔ آج کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا۔ میکاولی کے لئے یہ گوشہ نشینی کا زمانہ زحمت کے بھیس میں رحمت ثابت ہوا۔

۱۵۱۳ء میں میکاولی نے اپنی مشہور تصنیف "بادشاہ" تیار کی میکاولی کی تصانیف میں "بادشاہ" بلاشبہ سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے لکھنے سے میکاولی کا جو مقصد تھا اسے خود میکاولی نے اپنے ایک خط میں جو اس کے دوست فرانسسکو ویتوری کے نام ہے اور ۱۰ر دسمبر ۱۵۱۳ء کو لکھا گیا ہے' ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"ادھر شام ہوئی اور میں گھر واپس آیا اور مطالعہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ داخل ہونے سے پہلے میں گرد و غبار میں اٹے ہوئے کپڑے اتار ڈالتا ہوں اور شریفانہ درباری لباس پہن لیتا ہوں۔ جب اس طرح مناسب لباس پہن کر قدیم درباروں میں حاضری دیتا ہوں تو یہاں لوگ مجھ سے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور مجھے وہ غذا نصیب ہوتی ہے جو مجھے بہت ہی مرغوب ہے۔ میں ان سے اپنے دل کی باتیں کہنے سے ذرا نہیں جھجکتا۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں جو کچھ کیا' ان کا ان سے سبب دریافت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر کچھ ایسے مہربان ہیں کہ مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ اس طرح چار گھنٹے گذر جاتے ہیں اور تکان ہے کہ مجھے چھو نہیں جاتا۔ اتنی دیر کے لئے میں

اپنی ساری مصیبتیں بھول جاتا ہوں' افلاس کا خیال مجھے پریشان نہیں کرتا' موت کے خیال سے مجھے ذرا دہشت نہیں ہوتی۔ اتنی دیر بس ان عظیم الشان شخصیتوں کا دھیان میرے ذہن میں پوری طرح چھایا رہتا ہے۔ دانتے نے کیا خوب کہا ہے علم کا انحصار ان معلومات پر ہے جو انسان (اپنے حافظہ) میں محفوظ رکھ سکے۔ باقی فضول ہیں چنانچہ ان عالی مرتبت اشخاص کے ساتھ مکالمے سے جو کچھ مجھے حاصل ہوا وہ میں نے سپرد قلم کر لیا ہے۔ اور اس طرح ریاستوں (۱) پر ایک تصنیف تیار کی ہے۔ اس کتاب میں میں نے موضوع کے ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ مملکت کیا ہے۔ اس کی کتنی اقسام ہیں۔ وہ کس طرح حاصل کی جاتی ہے اور کس طرح برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ وہ کیونکر ضائع ہوتی ہے اور اگر اس سے پہلے کبھی بھی تم نے میرے خیالات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہوگا تو یقین ہے کہ یہ کتاب تمہیں ناپسند نہ آئے گی۔ رہے بادشاہ' خاص کر نئے بادشاہ تو انہیں اس کتاب کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے ژیولیا کے نام سے معنون کر رہا ہوں۔ اس مختصر سی کتاب کے پڑھنے سے تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ پندرہ برس جو میں نے آئین جہاں بانی کے مطالعہ میں صرف کیے۔ وہ رائیگاں نہیں گئے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا (بادشاہوں کے) خدام وہی بھلے جنہوں نے دوسروں کی زندگی سے سبق حاصل کیا ہو۔ رہی میری وفاداری تو اس میں شبہ کی گنجائش نہیں جس شخص نے عمر بھر وفا کی وہ وہ کیونکر دغا دے سکتا ہے۔ میری طرح وفادار اور ایمان دار شخص بھلا اپنی فطرت کیسے بدل سکتا ہے اور میرا افلاس میری ایمان داری کا سب سے بڑا ثبوت ہے"

---

(۱) واضح ہو کہ میکاولی شروع میں اپنی کتاب کا نام Principalities رکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں Prince رکھا اسی طرح انتساب بھی بدلا

کتاب مکمل ہونے سے پہلے اس میں کچھ اور ردوبدل ہوتا رہا۔ جس زمانہ میں کتاب زیر تصنیف تھی۔ اس وقت مختلف اثرات کارفرما تھے۔ چنانچہ اس کا نام بدلا' انتساب میں تبدیلی ہوئی اور اخیر میں لورنزو دی میدیچی کے نام معنون ہوئی۔ کتاب منسوب تو کر دی گئی مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ لورنزو کی خدمت میں باقاعدہ طور پر پیش کی گئی یا نہیں اور اس کی نظر سے گذری بھی کہ نہیں یقینی بات اتنی ہے کہ میکاولی کو اس کا کچھ صلہ نہ ملا میکاولی کی زندگی میں شائع بھی نہ ہو پائی گو لوگو کو اس کا علم ضرور تھا اور میکاولی کی زندگی میں اس سے سرقہ بھی کیا گیا۔ اس کی اصل عبارت کے متعلق آج تک اختلاف کا سلسلہ جاری ہے۔ کتاب پہلی مرتبہ ۱۵۳۲ء میں میکاولی کی موت کے پانچ برس بعد شائع ہوئی۔

میکاولی کی اور بھی تصانیف ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر اس کے مقالات Discourses ہیں اس کتاب کا مطالعہ "بادشاہ" کے ساتھ ضروری ہے۔ میکاولی کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں جو "بادشاہ" کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ "مقالات" کے مطالعے سے دور ہو جاتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۵۲۱ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے ذریعے سے میکاولی نے جمہوریتوں کی وہی خدمت انجام دینی چاہی ہے جو "بادشاہ" کے ذریعے بادشاہتوں کی۔ کتاب کیا ہے جمہوریتوں کے لئے نصائح کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ اس میں خاص طور پر قدیم رومہ کے عروج اور ترقی کے اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

۱۵۲۰ء میں میکاولی نے فن جنگ پر ایک رسالہ لکھا اس رسالہ میں ایسی کوئی خاص معلومات نہیں ہیں جو "بادشاہ" میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔

"تاریخ فلورنس" بھی میکاولی کی تصانیف میں خاصی اہم ہے یہ ۱۵۲۵ء میں مکمل ہوئی۔ اس کا جو حصہ پندرہویں صدی کی تاریخ سے متعلق ہے وہ خاص طور پر دل

چسپ ہے۔ میکاولی نے ایک رسالہ فرانس اور جرمنی کی سفارت سے متعلق بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ناول لکھے۔ مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔

یہ تمام تصانیف اس زمانے میں تیار ہوئیں جو مدیچی فلورنس کے دوبارہ مالک ہو چکے تھے اور میکاولی راندۂ درگاہ تھا۔ میدیچی حکومت کا سلسلہ ۱۵۱۲ء سے لے کر تقریباً" پندرہ سال تک قائم رہا۔ ۱۵۲۷ء میں وہ دوبارہ فلورنس سے نکالے گئے۔ اس زمانہ میں میکاولی بطور مصنف اور سیاسی مفکر کے غیر معمولی شہرت حاصل کر چکا تھا اور اگر اس کی عمر وفا کرتی تو شاید مدیچی کے زوال کے بعد اس کے دن پھرتے۔ گو یقینی نہیں مگر بہت ممکن تھا کہ وہ پھر مجلس دہ سری کا معتمد مقرر ہو جاتا یا کسی اور اہم عہدہ پر فائز ہو جاتا اور اس کی دلی مراد بر آتی۔ مگر میدیچی کو رخصت ہوئے چند ہفتے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ میکاولی اس دنیا سے سدھار گیا۔ (۲۲ جون ۱۵۲۷ء) موت کے وقت میکاولی کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ دوبارہ سیاست میں قدم رکھنے کی جو آرزو تھی وہ دل کی دل ہی میں رہی۔

میکاولی "بادشاہ" کے مصنف کی حیثیت سے صدیوں سے مورد لعن و طعن اور آماجگاہ دشنام رہا ہے۔ یہاں تک کہ یورپی زبانوں میں لفظ "میکاویلیت" شیطنت کا مترادف سمجھا جانے لگا۔ کسی کو میکاولی یا اس کا پیرو کہنا گویا اسے گالی دینا ہے۔ خود میکاولی کی زندگی میں اس پر لے دے شروع ہو گئی تھی اور اس کی موت کے بعد "بادشاہ" کے متعدد جواب لکھے گئے۔ شاہ پروشیہ فریڈرک اعظم نے اپنی جوانی کے زمانہ میں "رد میکاولی" Anti Machiavelli کے نام سے "بادشاہ" کا جو جواب لکھا وہ خاص طور پر مشہور ہوا گو اپنی حکومت کے زمانے میں خود اس کا طرز عمل ایسا تھا کہ اسے میکاولی کا صحیح معنوں میں شاگرد کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ "رد میکاولی" لکھنے کے

تین ہی سال بعد تمام عہد ناموں کو بالائے طاق رکھ کر فریڈرک نے جس طرح سائلیسیا پر حملہ کیا وہ میکاویلیت کی بہترین مثال ہے۔ اور اگر فریڈرک کو میکاولی کا زمانہ ملا ہوتا تو یقین ہے کہ اطالیہ کے ایک معمولی سے فرماں روا کی بجائے وہ فریڈرک اعظم کو اپنے سامنے بطور نمونے کے رکھتا۔ بہرحال میکاولی پر یہ لے دے آج تک جاری ہے چنانچہ دور جدید کے سب سے بڑے اسلامی شاعر نے بھی اسی انداز میں کچھ کہا ہے۔

آن فلارنسا دی باطل پرست — سرمہ او دیدۂ مردم شکست
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت — در گل مادانہ پیکار کشت
مملکت رادین او معبود ساخت — فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا برپائے این معبود زد — نقد حق را بر عیار سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است — حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

لیکن انیسویں صدی آئی تو میکاولی کو خاص طور پر اطالیہ میں ایک نئے نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اطالیہ میں اتحاد اور آزادی کی تحریک اٹھی تو اس کے ابتدائی علم برداروں میں میکاولی کا نام بھی شمار ہونا شروع ہوا اور میکاولی قومی ہیرو کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اس زمانے میں جرمنی میں جو اطالیہ کی طرح ایک خاص سیاسی دور سے گزر رہا تھا۔ میکاولی کے مداح پیدا ہوئے اور اس طرح اس کی تعلیمات کو جواب تک ذلیل و خوار سمجھی جاتی تھیں۔ نئی تعبیریں ہونے لگیں۔

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

میکاولی دنیا کے لئے ایک معمہ سا بن کر رہ گیا۔ گذشتہ سو' سوا سو سال میں میکاولی اور خاص طور پر اس کی کتاب "بادشاہ" پر لوگوں نے جو اظہار رائے کیا اسے اگر مجموعی ... کسی نے میکاولی کو شیطنت کا مجسمہ سمجھا اور کسی

نے ایک زبردست محب وطن۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی کتاب دنیا پر شاہی جبرو ستم کو برقرار رکھنے کا ایک آلہ ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ نہیں یہ تو میکاولی کی محض ستم ظریفی ہے جو اس نے گفتگو کا یہ انداز اختیار کیا ہے۔ اس کا مقصد تو جابر بادشاہوں پر ایک خطرناک طنز ہے۔ وہ دراصل بادشاہوں کے خلاف قوم کو ابھارنا چاہتا ہے! کوئی میکاولی کو جدید فلسفہ سیاست کا پہلا امام گردانتا ہے جس نے مذہب کو سیاست سے جدا کر کے علم سیاسیات کی روش ہی بدل دی اور کوئی اس کی تعلیمات کو سرے سے نکمّی' نہایت مضرت رساں اور شرارت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ ایک اس کی شرافت کا قائل ہے اور اس کی نجی اور سیاسی زندگی کا مداح' اور ایک اس کا دل کھوٹا' دماغ ٹیڑھا اور اس کی روح خبیث بتلاتا ہے اور ثبوت کے طور پر کہتا ہے کہ ایسا نہ ہوتا تو وہ سیزر بورژیا کو جس کے ہاتھ ایسی بری طرح خون آلود تھے کیونکر اپنے سامنے نمونے کے طور پر رکھتا۔

میکاولی کے بارے میں اتنا شدید اختلاف رائے بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میکاولی کی شخصیت واقعی ہی بڑی پیچیدہ شخصیت ہے اور یہ اس لئے کہ اس کا زمانہ خود بڑا پیچیدہ زمانہ ہے۔ یہ زمانہ بڑی مشکلات' اختلافات اور تضادات کا زمانہ ہے۔ یوں یہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں کہ جو مصنف ایک صفحہ پر آزادی اور حب وطن کے گیت الاپتا ہے وہ دوسرے صفحے پر دغا اور فریب کی کیونکر تعلیم دے سکتا ہے۔ جس شخص کا مقصد اطالیہ کو متحد کرنا ہو وہ کیونکر قتل و غارت گری کو سراہ سکتا ہے۔ جس کے مقاصد ایسے اعلیٰ ہوں وہ ایسے ادنیٰ ذرائع کو کام میں لانے کی کیونکر تلقین کر سکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ اگر ان حالات سے کماحقہ واقفیت حاصل ہو' جن میں میکاولی کی زندگی گذری' میکاولی اپنے زمانہ کا صحیح نمائندہ ہے۔ اس کی تعلیمات کو پندرھویں اور سولھویں صدی کی اطالوی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور اس زمانے کی تاریخ کو سمجھے

کی تاریخ کو سمجھے بغیر میکاولی کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس مختصر سے مقدمہ میں اس کی گنجائش نہیں کہ تاریخی حالات مفصل بیان کیئے جائیں۔ تاریخ کے دو تین پہلوؤں کی طرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سلطنت روما کے زوال کے بعد اطالیہ میں واحد قومیت کی روح بالکل فنا ہو چکی تھی۔ سارے ملک میں ایک حکومت قائم کرنے کی کوششیں ضرور ہوئیں مگر یہ سب ناکام رہیں۔ پندرہویں صدی کا آخری اور سولہویں صدی کا ابتدائی حصہ وہ زمانہ ہے جب اطالیہ متعدد علاقوں میں منقسم تھا جس میں پانچ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میلان

وینس

فلورنس

ریاست ہائے پاپائی اور

نیپلس

ان مملکتوں میں آپس میں غضب کی چشمک رہتی تھی۔ اس صورت میں آزادی کیونکر برقرار رہ سکتی تھی۔ ان پانچوں میں سے ایک بھی مملکت اس قابل نہ تھی کہ دو سروں کو نیچا دکھا کر ملک کو ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتی۔ پھر آپس میں رقابت اس بلا کی تھی کہ وفاقی یا اسی قسم کا کوئی دوسرا دستور اختیار کرنے کا کسی کو خیال بھی نہ آسکتا تھا۔ غرض قومی مفاد خطرہ میں تھا۔ اور ان پانچ مملکتوں کے سوا جو بے گنتی چھوٹی موٹی ریاستیں تھیں وہ ہمیشہ سازشوں میں مبتلا رہتی تھیں۔ کبھی ایک مملکت کے ساتھ ساز باز کبھی دوسرے کے ساتھ۔ دھوکے اور دغا پر بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد تھی۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بیرونی بادشاہ اطالیہ کو قسمت آزمائی کے لئے ایسی آسانی سے منتخب کر لیتے تھے۔ اطالیہ

دوسری اقوام کے حملوں کا شکار بنا ہوا تھا۔ اپنی مدافعت ان مملکتوں کے لئے ممکن نہ تھی۔ اس لئے کہ تمام اطالوی مملکتوں نے اپنی حفاظت کرائے کے سپاہیوں کے سپرد کر رکھی تھی۔ پھر کیوں نہ ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن اور سوستانی فوجیں ملک کو تاراج کرتیں؟ اطالوی مملکت میں کسی میں اتنا بل بوتا نہ تھا کہ فرانس یا ہسپانیہ کی روک تھام کر سکے۔ کرائے کے ٹٹوؤں سے کبھی کہیں ملکوں کی مدافعت ہوئی ہے، پھر ایسا نفاق، ایسی رنجشیں، ایسی نااتفاقی۔ اس دور میں اطالیہ کا قومی وجود ختم ہو چکا تھا اور اطالیہ محض ایک "جغرافیائی اصطلاح" بن کر رہ گیا تھا۔ حب وطن کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا اور لوگ نفسا نفسی میں مبتلا تھے۔ مقصد اطالیہ کی عظمت نہیں کسی طرح اپنی جان بچانا اور اپنے مفاد کی نگہبانی کرنا تھا۔

ایسی صورت میں غیروں کی نظریں اطالیہ پر نہ پڑتیں، یہ کیسے ممکن تھا؟ چارلس ہشتم شاہ فرانس نے ۱۴۹۴ء میں اطالیہ پر حملہ کیا۔ اس نے اطالوی مملکتوں کے آپس کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ خود میلان کے حاکم نے چارلس کو اطالیہ پر حملہ کرنے اور نیپلس کو نیچا دکھانے کی دعوت دی۔ چارلس نے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ فلورنس کے حاکم پیرو کو ذلت آمیز شرائط قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلورنس کے لوگ اس کے خلاف اٹھے اور پیرو نے وینس کی راہ پکڑی۔ فلورنس میں چارلس خود داخل ہوا اور وہاں سے رومہ کا رخ کیا پاپائے رومہ جو اب تک نیپلس کو ہر طرح مدد دیتا رہا تھا گھبرایا اور چارلس سے بہت کچھ دے دلا کر معاملہ کر لیا۔ اب نیپلس کی باری آئی اور جس طرح اب تک چارلس کو کامیابی ہوتی رہی تھی وہ نیپلس میں بھی ہوئی۔ تب جا کر بعض اطالوی ریاستوں کی آنکھیں کھلیں اور وینس کی "لیگ" قائم ہوئی جس میں میلان، وینس اور یورپ سب شامل تھے۔ چارلس کی فتوحات کچھ

فتوحات کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئیں اور جب ۱۴۹۵ء میں وہ اطالیہ سے واپس ہوا تو
اس کی فتوحات بھی کالعدم ہوگئیں۔

۱۴۹۸ء میں چارلس ہشتم کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس کے انتقال کے بعد بھی
اطالیہ پر حملوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ اس کے جانشین لوئز دواز دہم نے میلان پر حملے کا
فیصلہ کیا۔ پاپائے رومہ (الگزانڈر) اور ریاست وینس نے "لیگ" سے کنارہ کشی
اختیار کی اور فرانس کے حلیف بنے۔ مملکت میلان کیوں کر اکیلے مقابلہ کر سکتی تھی۔
لودودیچو نے بہت ہاتھ پاؤں مارے پھر ایک بنائے نہ بنی اور اگست ۱۴۹۹ء میں فرانسیسی
اطالیہ میں داخل ہوگئے۔ ادھر وینس نے بھی حملہ کر دیا۔ لودودیچو کو راہ فرار اختیار
کرنا پڑی اور میلان پر فرانسیسیوں اور اہل وینس کا قبضہ ہوگیا۔ مگر کچھ ہی دنوں میں
نئے حاکم بہت ہی غیر ہر دلعزیز ہوگئے اور اس سے فائدہ اٹھاکر لودودیچو نے فرانسیسیوں
کو شکست دی۔ گو آخر میں جیت فرانسیسیوں ہی کی رہی۔ میلان پر قبضہ جمانے کے بعد
فرانس اور ہسپانیہ نے نیپلس کے بارے میں آپس میں سمجھوتہ کرلیا۔ اور دونوں
حکومتیں نیپلس سے ۱۵۰۲ء میں بر سرپیکار ہوئیں۔ اور ۱۵۰۳ء کے صلح نامہ کی رد سے
نیپلس' ہسپانیہ اور فرانس میں تقسیم ہوگیا۔ مگر یہ صلح نامہ جس روشنائی سے لکھا گیا تھا
وہ ابھی سوکھ بھی نہ پائی تھی کہ ہسپانیہ اور فرانس میں پھر جنگ چھڑ گئی اور فرانس کو نیچا
دیکھنا پڑا۔ مگر فرانس کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ اب بھی نہ ہوا۔ پوپ اور الیگزانڈر
ہشتم اور اس کے بیٹے سیزرے بورژیا اپنے دل میں رومہ پر قبضہ جمانے کی ٹھان چکے
تھے اور اس سلسلے میں فرانس کو اطالوی معاملات میں برابر دخل اندازی کا موقع ملتا
رہا۔ ادھر وینس کی بڑھتی ہوئی طاقت دوسری اطالوی حکومتوں کی نظر میں کانٹے کی طرح
کھٹکتی تھی۔ شاہ فرانس شہنشاہ ماکسی میلیئن' پاپائے رومہ اور بعض دوسری چھوٹی
ریاستیں آپس میں مل گئیں اور وینس پر دھاوا بول دیا۔ غرض اطالیہ پندرہویں صدی

کے اخیر اور سولھویں صدی کے شروع میں بری طرح آپس کی خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت کا شکار تھا۔ اس افراتفری کا میکاولی پر ایک خاص اثر ہوا۔

ان حالات پر غور کرنے سے میکاولی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اطالیہ کی نجات اسی میں پوشیدہ ہے کہ ملک کو ایک بڑی مملکت میں متحد کیا جائے اور ایک قومی فوج تیار کی جائے جس میں غیرملکیوں کو اطالیہ سے نکال کر باہر کرنے کی صلاحیت ہو۔ اگر ایک طرف "بادشاہ" کو لوز نرد کے نام سے منسوب کرنے سے میکاولی کا یہ مقصد تھا کہ میدیچی کو اپنی طرف مائل کر لے اور ان کی ہمدردی حاصل کرے تو دوسری طرف لوز نرو کے سامنے ایک ایسا پروگرام بھی پیش کرنا چاہتا تھا جس کی مدد سے ملک کو بیرونی حکومت اور اندرونی کش مکش سے نجات دلائی جاسکے اس مقصد کے نیک اور اعلیٰ ہونے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میکاولی اس کے حصول کے لئے ایسے رکیک اور ادنیٰ ذرائع کیوں تجویز کرتا ہے۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخص کا مقصد خدمت قوم و وطن ہو وہ کیونکر چال بازی' دغابازی اور فریب کو اس کے حصول کا ذریعہ بناسکتا ہے مگر یہ گتھی بھی میکاولی کے زمانے کے سیاسی اخلاق پر نظر دوڑانے سے کھل جاتی ہے۔

میکاولی کے زمانے کی معاشرتی حالت کو دیکھنے سے خاص طور پر دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ قوم پر آزادی کے لوٹے جانے اور آپس کی نااتفاقیوں کا بہت ہی برا اثر پڑا تھا۔ دوسرے تعیش اور مذہبی زوال نے اخلاق کو بگاڑ دیا تھا۔ عہد وسطیٰ ختم ہوا تو اس دور کے تمام ادوار اور روش زندگی کو سخت دھکا لگا۔ پرانا گھر گر چکا تھا۔ نئے کی تعمیر ابھی نہیں ہونے پائی تھی۔ دور جدید کے شروع میں خاص طور پر اطالیہ میں اخلاق کے مسلمہ اصولوں کی بجائے وجدان کو لوگوں نے اپنا رہنما بنایا تھا۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اطالیہ میں بداخلاقی کا دور دورہ تھا اور ہر شخص اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

ادنیٰ طبقوں میں نجی زندگی اب بھی بہت سے پرانے اخلاقی اصولوں کی پابند تھی۔ اعلیٰ طبقوں کی اور بات تھی اور جن کا سیاست سے کچھ بھی تعلق تھا' ان کے متعلق کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اطالوی سیاسیئین پر دوسرے ممالک میں ذرا اعتبار نہ کیا جاتا تھا۔ خود اعلیٰ طبقے کی زندگی میں ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ فلورنس میں جہاں سیاسی اختلافات حد سے بڑھ چکے تھے آپس کے تعلقات' بدگمانی' حسد اور نفرت جیسے جذبات پر مبنی تھے۔ ایمان داری' وفا اور بھلمنساہٹ کا اس زمانہ کی سیاست میں کام نہ تھا۔ حاکم یا تو اخلاق کے اصولوں کو عزیز رکھ سکتے تھے یا مملکت کو۔ میلان اور نیپلس میں جہاں سیاسی آزادی نام کو باقی نہ رہی تھی' مظلوموں کے پاس بس وہی ہتھیار تھے جو غاصب اور ظالم حکام یا فرمانرواؤں سے انہوں نے حاصل کئے تھے یعنی سازش اور خفیہ قتل۔ چھوٹی ریاستوں میں حالات اور بھی ناگفتہ بہ تھے۔ اس صورت میں طاقت حاصل کرنا بجائے خود ایک مقصد ہو گیا تھا۔ ذرائع میں اچھے برے کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ سیاست میں مملکت کو بچانے کی خاطر اخلاق کو اکثر خیرباد کہا جاتا تھا۔ مختصر طور پر یہ تھا وہ سیاسی' اخلاقی اور ذہنی ماحول جس کا عکس ہم میکاولی کے خیالات میں پاتے ہیں مگر ان خیالات کا اصل سبب دریافت کرنا ایک چیز ہے اور انہیں صحیح تسلیم کرنا اور بات ہے۔

میکاولی کی تعلیمات اور انسانی فطرت کے بہت ہی پست تصور پر مبنی ہیں۔ انسان شاید ایک حد تک ایسا ہی ہے جیسا کہ میکاولی کو وہ نظر آتا ہے "ناشکر گزار' دھوکہ باز اور حریص" مگر میکاولی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ سب انسان ایسے نہیں۔ پھر میکاولی کو یہ نہ بھولنا چاہیے تھا کہ جو انسان اس کی عام تعریف پر پورے بھی اترتے ہیں ان سے بھی کبھی کبھی شرافت اور سخاوت کے اوصاف ظاہر ہوتے ہیں۔

میکاولی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ گو اس نے یہ تو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اخلاقیات کے اصولوں کی سیاسی زندگی میں کوئی جگہ نہیں مگر اس نے یہ نہ بتایا کہ جس سیاست کی بنیاد دغا اور فریب پر ہوگی وہ کبھی پھلنے پھولنے والی نہیں ایسی سیاست کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہوں گی۔ جھوٹ اور دغا سے وقتی طور پر سیاست میں کام لیا جاسکتا ہے، مستقل طور نہیں۔

گر کی بات بس اتنی ہے کہ اگر میکاولی صرف یہ کہتا کہ سیاست میں چالبازی، دغا اور فریب سب سے کام لیا جاتا ہے تو کسی کو اس سے پرخاش نہ ہوتی۔ دنیا میں یہ ہوتا ہی چلا آیا ہے اور شاید ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ سیاست میں ان ہتھیاروں سے کام لینا چاہیے! بس یہی زیادتی کی۔

اسی طرح میکاولی نے سیاسی اخلاق کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا جس کی بنیاد سیاسی مصلحت پر رکھی۔ انگریزی میں اسے Reason of State کہا جاتا ہے۔ میکاولی کو اس کا بانی تو کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ نہ صرف سیاستداں کا اس اصول پر ہمیشہ سے عمل رہا تھا بلکہ بڑے مفکروں نے بھی اس کا پہلے ذکر کیا تھا۔ (۱) مگر میکاولی نے اس نئے اخلاق کے اصولوں کو ایک مستقل نظام میں منسلک کرنے کی کوشش کی، جہاں ریاست کی زندگی اور موت کا سوال ہوا اور عام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھنے سے کام نکل سکتا تو میکاولی کے خیال میں اسے اختیار کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہی ایک اصول ہے جس کی پابندی فرض ہے۔

---

(۱) اس خیال کی تاریخ فریڈرش مائنکے Friedrich Meinecke, Die Idee der Staatsrason میں مفصل درج ہے۔ برڈ Burd کے ایڈیشن میں لارڈ اکمیٹن کا مقدمہ بھی اس موضوع پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔

جس منطقی استدلال سے میکاویلی اس نظریہ پر پہنچا مختصراً" یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اپنے مقبوضات کو وسعت دینے اور طاقت کو حاصل کرنے کی خواہش ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ اور انسان ہی پر کیا موقوف ہے سب جانداروں کا یہی حال ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے وہ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے مقبوضات کو سعت دیں اور اپنی طاقت میں اضافہ کریں۔ انسان جب تہذیب کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اور اپنی اجتماعی زندگی کی بنیادیں استوار کرتا ہے تو اسے اخلاق اور قانون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسے طاقت کی ہوس اور اخلاقی ذمہ داریوں کے احساس کے درمیان رابطہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی رابطہ کا نام "سیاسی مصلحت" ہے۔ سیاسی مصلحت کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ نہ تو مثالی اور واقعی اور نہ عقلی اور جبلی معیار ایک ہیں۔ طبیعی اور رومانی میلانات ایک درمیانی نقطہ پر ملتے ہیں۔ مقصد اخلاقی نقطہ نظر سے نہایت ہی اعلیٰ وارفع ہے یعنی جماعت کی فلاح وبہبود لیکن اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی نہایت ہی ادنیٰ اور رکیک ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ سیاسی مصلحت کبھی نیکی کی طرف لے جاتی ہے کبھی بدی کی جانب۔ مملکت اور دوسرے انسانی اداروں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دوسرے ادارے مثالی معیاروں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں مگر مملکت کے لئے یہ ممکن نہیں۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ مملکت جو قانون کی نگہبان ہوتی ہے۔ خود ہمیشہ قانون کی پابندی نہیں کر سکتی۔ اس لئے مملکت کا قیام اگر ایک طبعی عالم طبیعی میں ہوتا تو دوسری طرف عالم اخلاق میں۔ دونوں میں کش مکش ہمیشہ سے جاری ہے اور ان میں سے کوئی بھی ہار ماننے کے لئے تیار نہیں۔

میکاولی کے کئی سو سال بعد ہیگل نے مملکت کو اصل اخلاق کی عملی شکل قرار دے کر اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مملکت خود ایک مقصد بن گئی اور اس کا سب سے بڑا فرض اپنی حفاظت اور بقا قرار پایا۔ ہیگل نے جس طرح میکاولی کو اپنایا اس کے لئے مائنکے نے جو الفاظ استعمال کئے اس کا ترجمہ انگریزی میں Legitimisationofabastard کہہ کر کیا جاسکتا ہے۔

میکاویلیت سولہویں صدی کے سیاسی ماحول کی پیداوار ہے اور سولہویں صدی میں وہ عالم شباب پر تھی۔ تامس کرامول جو ہنری ہشتم کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اطالیہ سے "بادشاہ" کا ایک نسخہ اپنے ساتھ انگلستان لایا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سوتا بھی تھا تو اسے سرہانے رکھ کر لورنزد جس کے نام کتاب معنون کی گئی تھی۔ اس کی بیٹی کیتھرین دی میدیچی نے ہزاروں پروٹسنٹوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ کسی مذہبی جذبہ کی بنا پر نہیں بلکہ صرف سیاسی مصلحتوں کی خاطر۔ اور گو پاپائی رومہ نے اس ممنوعہ کتابوں کی فہرست میں داخل کیا۔ مگر سولہویں صدی کے پوپ اس کتاب کے اصولوں پر اسی طرح کاربند ہوتے رہے جس طرح دوسرے دنیاوی حکمران۔ میکاولی بدنام ضرور ہوا مگر حکمرانی کے جوگر اس نے بتائے تھے ان پر اکثر حکمران عمل کرتے رہے بیکن جو اپنے وقت کا بڑا مفکر ہے میکاولی کو ان الفاظ میں نذر عقیدت پیش کرتا ہے کہ "میکاولی ہمارے شکریہ کا اس وجہ سے مستحق ہے کہ اس نے وہ بتایا جو حکمران کرتے چلے آئے ہیں اور کرتے ہیں، نہ وہ جو انہیں کرنا چاہیے۔"

✪ ☐ ✪

بادشاہ

فہرست مضامین

انتساب

نکولو میکاویلی کی جانب سے عالی جاہ لورنز(۱) دی پیرو دے میدیچی کے نام

جو لوگ بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ عام طور پر ان کے پاس ایسے تحائف لے کر حاضر ہوتے ہیں جن کی بادشاہوں کی نظر میں قدر ہو یا جن سے ان کو خوشی حاصل ہو۔ چنانچہ بادشاہوں کو اکثر ان کے شایان شان نذرانے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً "گھوڑے" اسلحہ' زری کے کپڑے' جواہرات اور زیورات۔

میری بھی یہ تمنا ہے کہ اپنے خلوص کی نشانی لے کر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر اپنے سارے سازو سامان پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس میں مجھے (کم از کم اپنے خیال میں) ایک چیز سب سے زیادہ قیمتی دکھائی دیتی ہے۔ میری مراد ہے اس علم سے جو مشاہیر کے طرز عمل اور کارناموں سے متعلق ہے۔ یہ علم میں نے جدید معاملات

---

(۱) سال پیدائش ۱۴۹۲ء سال وفات ۱۵۱۹ء فلورنس کا حکمران تھا

سے پرانے تعلق اور قدیم معاملات کے مسلسل مطالعہ کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ بہت دنوں کی محنت اور غور و فکر کا نچوڑ یہ چھوٹی سی کتاب ہے جسے اعلیٰ حضرت کو نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

گو اس تصنیف کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ مگر مجھے آپ کی ذرہ نوازی پر بڑا بھروسہ ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ اس سے زیادہ میری بساط نہیں کہ کئی سال کی کوشش، انتہائی محنت اور طرح طرح کے خطروں کا مقابلہ کر کے میں نے جو علم حاصل کیا ہے۔ اس کا لب لباب اس طرح آپ کے سامنے پیش کروں کہ تھوڑے سے وقت میں آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔ میں نے یہ کوشش نہیں کی کہ اسے خوبصورت الفاظ یا خطیبانہ کلمات اور دوسری ظاہری خوبیوں سے سجاؤں جو اس قسم کی تصانیف میں اکثر ہوتی ہیں۔ مجھے یہ قبول ہے کہ اس کتاب کی مدح و ثنا سرے سے نہ ہو لیکن اگر ہو تو اس وجہ سے ہو کہ اس میں سچائی اور وزن ہو۔

مجھ جیسے حقیر و ناچیز شخص کی یہ کوشش کہ نہ صرف بادشاہوں کے متعلق کچھ لکھوں بلکہ ان کے لئے دستور العمل متعین کروں ممکن ہے آپ کی نظر میں کھٹکے مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے متعلق کسی مغالطہ میں مبتلا ہوں۔ بلکہ یوں خیال کریں کہ جو کوئی سرزمین کی تصویر اتارنا چاہتا ہے تو پہاڑوں اور بلند مقامات کو سامنے رکھنے کے لئے میدانوں میں اتر آتا ہے اور نیچے وادی کو سامنے رکھنا چاہتا ہے تو پہاڑوں اور ٹیلوں کا رخ کرتا ہے۔ اسی طرح رعایا کو سمجھنے کے لئے بادشاہ ہونا اور بادشاہ کو جاننے کے لئے رعایا سے ہونا ضروری ہے۔

میری التجا ہے کہ اعلیٰ حضرت اس کتاب کو اسی جذبہ محبت کے ساتھ قبول فرمائیں جس کے ساتھ یہ پیش کی جا رہی ہے۔ جب آپ اس کے مضامین پر غور و فکر فرمائیں گے تو آپ کو خود میری دلی خواہش کا اندازہ ہو جائے گا۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت کا مرتبہ بلند ہو۔ آپ ماشاء اللہ صاحب تقدیر بھی ہیں اور صاحب قابلیت بھی۔ اعلیٰ حضرت اپنی عظمت کی اونچائیوں سے کبھی نیچے کی دنیا پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ بندہ کس بری طرح قسمت کی گردش کا شکار ہے، پھر بلاوجہ اور پیہم (۱)

---

(۱) ۱۵۱۲ء میں جب میدیچی خاندان کو دوبارہ حکوت ملی تو میکاولی کی پہلے تو نوکری لی گئی اور فروری ۱۵۱۳ء میں میدیچی حکومت کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں گرفتار ہوا۔ گو بعد میں جب الزام ثابت نہ ہوا تو رہا کر دیا گیا۔

باب ۱

حکومت کی وہ اقسام اور وہ طریقے جن سے وہ معرض وجود میں آتی ہے۔

چاہے تاریخ پر نظر دوڑائیے اور چاہے آج کی دنیا پر۔ جب کبھی آپ انسان پر انسان کو حکومت کرتے دیکھیں گے تو یہ حکومت یا تو جمہوری طرز کی حکومت ہوگی یا بادشاہت۔ بادشاہی حکومتیں موروثی ہوتی ہیں۔ جو باپ دادا سے ورثہ میں چلی آتی ہی یا نئی ہوتی ہیں پھر نئی بادشاہت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو نئے سرے سے قائم ہو جیسے فرانس کی اسفورزا [۱] کی حکومت میلان پر۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی مملکت مغلوب ہوکر کسی پرانی مملکت کا جزو بن جائے۔ جس طرح نیپلس کی ریاست ہسپانیہ کا جزو [۲] بن گئی۔ ایسے علاقے نئی مملکت میں شامل ہونے سے پہلے یا تو کسی بادشاہ کے ماتحت رہے ہوں گے یا آزاد۔ انہیں زیر کرنے کے لئے کبھی بادشاہ خود اپنی قوت استعمال کرتا ہے اور کبھی دوسروں کی۔ پھر اس کام میں کبھی تقدیر اس کا ساتھ دیتی ہے اور کبھی اس کی اپنی کوشش کو اس میں دخل ہوتا ہے۔

---

(۱) ۱۴۰۱ء تا ۱۴۶۶ء کرائے کے سپاہیوں کے مشہور لیڈر کا بیٹا اور میلان کے نواب فلپو ماریا کا داماد پہلے تو اہل وینس کی مدد سے سپہ سالار بنا مگر پھر ان سے ان بن ہوگئی اور وہ میلان کا حکم بن گیا۔

(۲) بذریعہ فرڈی نینڈ ۱۵۰۱ء

باب ۲

خاندانی بادشاہتیں

اس وقت میں جمہوریتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ کسی دوسری جگہ میں نے ان پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔[1] یہاں پر میں صرف بادشاہتوں کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ میں نے ابھی شاہی حکومتوں کی جو تقسیم کی ہے اس کے مطابق ان پر کیونکر حکومت کی جائے اور انہیں کیسے برقرار کھا جائے میرا دعویٰ ہے کہ نئی حکومتوں کی نسبت موروثی حکومتوں کو چلانا زیادہ آسان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ ایک خاص خاندان کی حکومت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ موروثی بادشاہوں کے لئے بس اتنا ضروری ہے کہ وہ اپنے آباؤاجداد کے نقش قدم پر چلے۔ البتہ جب کوئی نئے واقعات پیش آئیں تو ان کا لحاظ کر لے۔ بادشاہ لائق ہو گا تو ضرور اپنا تخت سنبھال سکے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی دوسرا غیر معمولی قابلیت کا انسان اس کے تخت پر قابض ہو جائے لیکن اس صورت میں بھی جب کبھی غاصب پر وقت پڑے گا تو اسے پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اطالیہ میں اس کی ایک مثال ہماری آنکھوں کے سامنے ہے

---

(۱) اس کتاب کا نام

DiscorsiSopraLapsimaDecadedieTitoLivio

جس کی پہلی جلد ۱۵۱۳ء میں تصنیف ہوئی۔

یعنی ڈیوک آف فرارا [۲] جو پہلے ۱۴۸۴ء میں اہل وینس کے حملہ کو روکنے کے لئے نہایت زور و شور سے لڑا اور پھر جس نے ۱۵۱۰ء میں پوپ جولیس کے خلاف جنگ کی اور یہ سب یوں کہ مدت سے اس علاقہ پر اس کی حکومت چلی آرہی تھی۔ موروثی باوشاہ کے لئے اپنی رعایا کو ستانے کی نہ تو کوئی خاص وجہ ہے اور نہ ضرورت' وہ ہر دلعزیز ہوتا ہے اور لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ اس میں غیر معمولی عیوب ہوں جن کی وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ بادشاہت کی قدامت اور تسلسل کی وجہ سے تبدیلی کی خواہش اور اس کی یاد دل سے فراموش ہو جاتی ہے عمارتوں کی طرح حکومتوں میں بھی ایک تبدیلی سے دوسری تبدیلی کی گنجائش نکلتی ہے۔

---

(۲) مراد دو مختلف افراد ہیں گو دونوں فرار کے ڈیوک تھے ایک ارکول (۱۴۷۱ءتا۱۵۰۵ء) جسے ایک لڑائی میں ہارنے کے بعد جو ۱۴۸۲ء سے ۱۴۸۴ء تک جاری رہی وینس کی برتری قبول کرنی پڑی اور دوسرا الفانسو (۱۵۰۵ءتا۱۵۳۱ء) جس نے کامیابی کے ساتھ پوپ جولیس دوم کا دو سال تک (۱۵۱۰ءتا۱۵۱۲ء) مقابلہ کیا۔

باب ۳

غیر خالص حکومتیں

دقتیں پیش آتی ہیں حال کی حاصل کی ہوئی حکومتوں میں۔ خصوصاً" جب یہ حکومتیں بالکل نئی نہ ہوں بلکہ غاصب کے علاقے میں شامل کرلی گئی ہوں۔ اس طرح کی حکومت کو غیر خالص حکومت کہا جاتا ہے۔ ایسی بادشاہتوں میں گڑبڑ اور انقلابوں کا سبب وہ قدرتی پیچیدگیاں اور مشکلات ہوتی ہیں جو نئی فتوحات کے لوازم میں سے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ رعایا اپنے بادشاہ کا اپنی بہتری کی امید میں ساتھ چھوڑتی ہے۔ یہی امید اسے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ مگر عموماً" اس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا ہے اور تجربہ سے اسے پتہ چلتا ہے کہ بہتری کجا حالت اور بد تر ہوگئی۔ بد تر حالت کا بھی ایک عام اور قدرتی سبب ہے۔ نئے بادشاہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنی فوج کو حال میں فتح کئے ہوئے علاقوں میں اتارے۔ ان پر محصول لگائے اور اسی قسم کی ہزار باتیں ہیں جنہیں نئی فتح کے لوازم میں سے سمجھنا چاہیے جن جن کو نئے بادشاہ کے آنے سے دقتیں پیش آتی ہیں یا کسی قسم کا نقصان ہوتا ہے وہ بادشاہ کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں۔ رہے وہ جو نئے بادشاہ کے آنے کا سبب ہوئے سو ان کی دوستی قائم نہیں رہتی۔ نہ تو ان کی توقعات ہی پوری کی جاسکتی ہیں۔ اور نہ ان پر ان کے احسان کا لحاظ رکھتے ہوئے سختی ہی کی جاسکتی ہے۔ پس نیا علاقہ فتح کرنے کے لئے غاصب کا قوی ہونا اور اس کے پاس بڑی فوج ہونا کافی نہیں۔ اس علاقے کے باشندوں کی خوشنودی بہت ضروری ہے۔

یہی اسباب تھے کہ میلان کو شاہ فرانس لوئیز دوازدہم کے ہاتھ آتے تو دیر نہیں لگی۔ مگر وہ جلد ہی ہاتھ سے نکل بھی گیا[1] وہی لوگ جنہوں نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی امیدیں بر نہیں آئیں اور ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں تو پھر وہ نئے بادشاہوں کی اکڑفوں کو کیوں برداشت کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو ممالک بغاوت کرتے ہیں اور دوبارہ فتح کئے جاتے ہیں وہ آسانی کے ساتھ ہاتھ سے نہیں نکلتے۔ بات یہ ہے کہ بغاوت کو بہانہ بنا کر غاصب اپنا قبضہ جمانے کے لئے بلا روک و ٹوک مجرموں کو سزائیں دیتا ہے۔ مشتبہ لوگوں کی پردہ دری کرتا اور جہاں کوئی کم زوری دیکھتا ہے اسی وقت اس کا استیصال کر دیتا ہے۔ چنانچہ کاؤنٹ لوڈودک نے پہلی مرتبہ تو صرف ستا ستا کر اور سرحد پر چھاپے مار مار کر میلان کو فرانسیسیوں سے چھین لیا۔ لیکن دوسری دفعہ جب فرانسیسی میلان سے نکلے ہیں تو کیا کچھ جتن کرنا پڑے۔ ایک دنیا کو مسلح کر کے فرانسیسی بادشاہ کے خلاف کھڑا کیا گیا تاکہ اطالیہ سے اس کی فوجوں کو نکال کر باہر کیا جائے۔[2] اور اس کی وجہ وہی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔

---

(۱) لوئیز دوازدہم نے اہل وینس کے ساتھ میلان کو فتح کرنے کے لئے اتحاد کیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۴۹۹ء کو فرانسیسی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں ڈیوک لوڈوک فرار ہو کر جرمنی چلا گیا۔ جرمنی اور سوستانیوں کی مدد سے ۵ فروری ۱۵۰۰ء کو اس نے میلان پر پھر قبضہ کر لیا مگر جب فرانسیسیوں کو کمک پہنچی تو اسے ۵ اپریل ۱۵۰۰ کو پھر شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا۔

(۲) ۱۵۱۱ء میں پوپ جولیس دوم نے "مقدس لیگ" بنائی جس میں وینس فرڈیننڈ شاہ اراگان اور ہنری ہشتم شاہ انگلستان شامل ہوئے۔ سوستانیوں کی مدد سے ۱۵۱۲ء میں فرانسیسی لومبارڈی سے باہر نکال دیے گئے۔

تصویر کاایک رخ تو دیکھ لیا اب دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ لوئیز کو اس کا کیوں کر تدارک کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب اگر کوئی دوسرا شخص شاہ فرانس کی جگہ ہو تو وہ نئے مقبوضات پر اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان نئے حاصل کئے ہوئے صوبوں کا تعلق جو فاتح کے اپنے قلم رو میں شامل کر لئے گئے ہوں یا تو فاتح کے ملک اور زبان سے ہو گا یا کسی دوسرے ملک اور زبان سے۔ اگر ملک اور زبان ایک ہیں تو انہیں قابو میں رکھنا آسان ہو گا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ لوگ آزادی کے بہت زیادہ عادی نہ ہوں۔ قبضہ کو قائم رکھنے کے لئے بس یہ ضروری ہے کہ جس خاندان کی وہاں حکومت رہی ہو اسے نیست و نابود کر دیا جائے۔ عام باشندوں کی زندگی میں کسی قسم کا فرق نہ آئے گا اور ان کے رسوم جوں کے توں رہیں گے تو وہ نئی حکومت کو تسلیم کر لیں گے اور چپ چاپ زندگی گزاریں گے۔ برگنڈی بر ٹیان کاسگان اور نارمنڈی میں یہی ہوا۔ (۱) ان صوبوں میں ایک مدت سے فرانس کی حکومت ہے زبان میں معمولی سا فرق سہی مگر ان کے قوانین اور رسوم یکساں ہیں۔ اسی لئے وہ ایسی آسانی کے ساتھ فرانس کا جزو بن گئے ہیں۔ پس جو کوئی نیا علاقہ فتح کرے اور اسے قبضہ میں رکھنا چاہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھے۔ ایک ہے سابق بادشاہ کے خاندان کو ختم کرنا اور دوسرے نئے قوانین اور محصولوں سے اجتناب کرنا۔ اس اصول پر عمل کرنے سے تھوڑے ہی دنوں میں نئے علاقہ کو قلمرو سے ملحق کر کے دونوں

---

(۱) یہ صوبے مختلف اوقات میں فرانس میں شامل ہوئے۔ نارمنڈی کو شاہ فلپ آگسٹ نے ۱۲۰۴ء میں حاصل کیا گیا۔ کاسگان کو چارلس ہفتم نے ۱۴۵۳ء میں، اور برگنڈی کو لوئیز یازدہم نے ۱۴۷۷ء میں بر ٹیان ۱۴۹۱ء میں فرانس کو ملا جب وہاں کی شہزادی این سے چارلس ہشتم کی شادی ہوئی۔

کو ایک کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ قسمت ساتھ دے اور مناسب تدبیر بھی کی جائے اور سب سے بڑی اور کارگر تدبیر یہ ہے کہ غاصب وہیں جاکر سکونت اختیار کرے تاکہ اس کا قبضہ برقرار رہے' جیسا کہ ترکوں کے سلطان نے یونان (۱) میں کیا ہے۔ یونان کو قابو میں رکھنے کے لئے وہ چاہے جو بھی تدابیر اختیار کرتا' مگر کارگر نہ ہوتیں اگر سلطان وہیں جاکر نہ رہ پڑتا۔ بادشاہ خود موجود ہو تو یہ آسانی ہوتی ہے کہ فتنہ و فساد کا شروع ہی میں پتہ چل جاتا ہے اور اسے دبانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا لیکن اگر بادشاہ کسی دور دراز مقام پر قیام ہو تو فتنہ کا پتہ دیر میں چلتا ہے اور جب پانی سر سے اوپر آجائے۔ تب ایک بنائے نہیں بنتی ایک اور بات یہ ہے کہ اگر بادشاہ مفتوحہ علاقے میں بود و باش اختیار کر لے تو قریب ہونے کی وجہ سے رعایا کی اس تک پہنچ ہوتی ہے اور حکام کے ظلم و تعدی سے لوگ محفوظ رہتے ہیں اس کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ نیک افراد اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بد اس سے ڈرنے لگتے ہیں اگر کوئی اور ایسے صوبہ کو فتح کرنے کا ارادہ کرے تو اسے خاص اہتمام کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ بادشاہ جس جگہ خود رہتا ہے اس کو وہ آسانی سے اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دے گا۔

ایک اور کسی قدر بہتر تدبیر بھی ہے وہ یہ کہ ایک یا دو نہایت ہی اہم مقامات منتخب کئے جائیں اور ان میں نو آبادیاں بسائی جائیں۔ نو آبادیاں نہیں تو پیدل اور سوار فوج ان مقامات پر رکھی جائے مگر فوجیں رکھنے سے نو آبادیاں بسانا کہیں بہتر ہے۔ کم خرچ بالا نشین۔ نو آبادیاں بسانے اور ان کو قابو میں رکھنے میں بہت تھوڑے سے اخراجات ہوتے ہیں۔ نئے آنے والوں کی تعداد مختصر ہوتی ہے اور وہ ریاست کا چھوٹا

---

(۱) یونان سے مراد جزیرہ نمائے بلقان ہے جسے مراد دوم (۱۴۴۲ء اور محمد دوم ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) نے فتح کیا۔ ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ فتح ہو گیا تو سلطان نے وہیں سکونت اختیار کی۔

ساجزو ہوتے ہیں ان کی معاش اور قیام کے لئے حاکم کی دست اندازی بس ایسے لوگوں تک محدود رہتی ہے جن کے گھربار اور جائیدادیں وہ یوں بھی ضبط کرنا چاہتا ہے پھر جن کو اس سے نقصان پہنچتا ہے اور جو اس سے خفا ہوتے ہیں اور ادھر ادھر بکھرے ہونے کی وجہ سے' نیز افلاس کے سبب سے کسی قسم کی شرارت نہیں کرسکتے۔ باقی باشندے چین و آرام کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اس خوف سے شورش برپا نہیں کرتے کہ کہیں ان کا بھی وہی حشر نہ ہو جو ان کے ہمسایوں کا ہوا اور کہیں وہ بھی ہاتھ سے گھربار نہ کھو بیٹھیں۔

چنانچہ میں جس نتیجہ پر پہنچتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان نو آبادیوں پر خرچ کچھ نہیں ہوتا وہ وفادار ہوتی ہیں اور ان سے اصل باشندوں کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔ باقی رہے وہ تھوڑے سے اشخاص جن کو تکلیف پہنچتی ہے سو وہ اتنے مفلس ہوتے ہیں اور اس بری طرح بکھرے ہوئے کہ حاکم کا بال بیکا نہیں کرسکتے' اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لوگوں کو یا تو عنایتوں سے رام کرلینا چاہیے یا انہیں ملیامیٹ کردینا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی زیادتیوں کا انسان بدلہ لے لیتا ہے مگر بڑے مظالم کے جواب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ پس اگر کسی کو نقصان ہی پہنچانا مقصود ہو تو اس طرح کہ بدلہ کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔

نو آبادیاں بسانے کی بجائے فوج رکھنے کا فیصلہ کیا جائے تو مصارف بہت زیادہ برداشت کرنا ہوں گے۔ پھر چونکہ صوبہ کی تمام آمدنی اسی کو قابو میں رکھنے پر صرف ہوجائے گی۔ اس لئے اس فتح سے حاصل کچھ نہ ہوگا اور فائدہ کی جگہ الٹا نقصان ہوگا۔ ملک میں فوجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور ان کی جائے قیام بار بار بدلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوگی اور اس کے دل میں بدلہ لینے کی خواہش پیدا ہوگی۔ نیز جو لوگ اپنے ہی گھروں میں دوسروں کی زیادیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ

خطرناک اور جانی دشمن شاید ہی کوئی ہو۔ غرض جس نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے فوجیں رکھنے سے نو آبادیاں بسانا زیادہ بہتر ہے۔

علاوہ ازیں جو کوئی کسی دوسرے صوبہ میں جاکر حکومت کرے۔ اسے چاہیے کہ اپنے کمزور ہمسایوں کے سر پر دست شفقت رکھے اور ان کی مدافعت کرے اور جو طاقتور اور ذی اثر ہوں ان کا زور گھٹائے۔ اسے اس کا بھی خاص طور پر انتظام کرنا چاہیے کہ کوئی اپنی طرح طاقتور اجنبی اس صوبہ میں داخل نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ اکثر ہوتا ہے کہ جو لوگ ناراض یا غیر مطمئن ہوتے ہیں وہ کبھی حوصلہ اور لالچ کی وجہ سے اور کبھی خوف کی بنا پر کسی نہ کسی کو باہر سے بلواتے ہیں۔ مثال کے طور پر باشند گان ایتولیہ (۱) کو لیجئے۔ جو اہل رومہ کو یونان میں لانے کا سبب ہوئے۔ اہل رومہ کبھی بھی کسی دوسرے ملک میں داخل نہ ہوتے جب تک اس جگہ کے باشندے ان کو وہاں آنے کی شہ نہ دیتے۔ ان حالات میں عام طور پر جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بیرونی حاکم کے صوبہ میں داخل ہوتے ہی طاقتور لوگوں سے حسد کی وجہ سے کمزور اس سے جاملتے ہیں۔ ان کمزور افراد کو اپنی طرف کرلینا کوئی ایسا مرحلہ نہیں ایک دفعہ یہ لوگ فاتح کی جانب آجائیں تو پھر وہ آسانی سے اس کی مملکت میں گھل مل جاتے ہیں۔ فاتح کو بس ایک بات کا خیال لازم ہے یہ کہ وہ بہت زیادہ طاقتور نہ ہونے پائیں۔ ان کے ہاتھ میں بہت زیادہ اختیارات بھی نہ دینے چاہئیں۔ اس اصول پر وہ عمل پیرا ہو گا تو اپنی فوجوں اور متذکرہ

---

(۱) ایتولیہ یونان کے ایک شمالی حصے کا نام ہے۔ ۲۱۷ق۔م میں جب ایتولیہ کی وفاقی حکومت نے فلپ پنجم، شاہ مقدونیہ کے ہاتھوں شکست کھائی تو کسی بیرونی ریاست سے اتحاد کا خیال ہوا اور اس نے رومہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ چنانچہ جب رومہ اور یونان میں جنگ ہوئی تو اہل ایتولیہ نے خوب داد شجاعت دی اور اہل رومہ کو جو فتح ۱۹۷ق م میں حاصل ہوئی اس میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

متذکرہ بالا افراد کی مدد سے وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے ہمسایوں کو نیچا دکھا سکے گا۔ اور اس صوبہ کے سیاہ و سفید کا مالک بن جائے گا اور جو کوئی اس اصول پر عمل نہیں کرے گا اس کے ہاتھ سے حکومتی جاتی رہے گی اور جب تک اس کا قبضہ رہے گا اس وقت تک اسے ہزاروں تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آتی رہیں گی۔

اہل رومہ جب بھی کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تو اسی اصول پر عمل پیرا ہوتے فوجی نو آبادیاں بساتے اور کمزور امراء کو اپنے سایہ عاطفت میں لیتے' گو ان کی قوت میں اضافہ نہ ہونے دیتے' جو زیادہ قوی ہوتے انہیں سر نہ اٹھانے دیتے اور کسی غیر بادشاہ کو ان سے ساز باز کا موقع نہ دیتے۔ مثال کے طور پر یونان کا ذکر کافی ہے۔ باشندگان اتیولیہ واکے کو کس طرح اہل رومہ نے اپنے تحت لیا اور مقدونیوں کو کس طرح دبایا اور انیتوکس (۱) کو نکال باہر کیا۔ لیکن باجوود ان تمام خوبیوں اور وفاداریوں کے اہل اکے اور اہل اتیولیہ کے اختیارات میں کسی قسم کا اضافہ روا نہ رکھا گیا۔ فلپس (۲) نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور ہزار التماس کی مگر اہل رومہ اس کے اس وقت تک دوست نہ بنے جب تک اسے زیر نہ کر لیا۔ اور انیتوکس باوجود اپنی قوت کے انہیں اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ صوبہ کی حکومت میں اس کا ذرا بھی دخل ہو۔ رومیوں نے وہی کیا جو ہر عادل بادشاہ کو کرنا چاہیے جس کی نظر نہ صرف حال بلکہ مستقبل کی دقتوں پر بھی ہو

---

(۱) انیتوکس ثالث مراد ہے ملک شام کا بادشاہ ۱۹۲ ق م میں اتیولیہ کی دعوت پر اپنی فوجوں کے ساتھ یونان آیا اور اہل رومہ سے جنگ کی مگر منہ کی کھائی اسے زبردست شکست ہوئی۔

(۲) فلپ پنجم شاہ مقدونیہ مراد ہے اس نے انیتوکس کے خلاف رومیوں کا ساتھ دیا مگر اسے اپنی فتوحات کا ایک حصہ جنگ کے بعد واپس کرنا پڑا اس لئے کہ اہل رومہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی طاقت بہت بڑھ جائے۔

اور جسے ان دقتوں کو کسی نہ کسی طرح سر کرنے کی فکر بھی ہو۔ اس لئے کہ اگر آنے والے خطرے کا پہلے سے پتہ چل جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ کاٹ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر بے توجہی برتی جائے یہاں تک کہ خطرہ سر پر آن موجود ہو تو پھر ایک بنائے نہیں بنتی۔ اس کی مثال تپ دق جیسی ہے جس کے متعلق طبیبوں کا خیال ہے کہ شروع میں اس کی تشخیص مشکل ہوتی ہے اور علاج سہل اور بعد میں تشخیص آسان سہی مگر علاج بہت ہی کٹھن ہوتا ہے۔ بس یہی حال سیاسی معاملات کا ہے۔ اگر فتنوں کو دور سے پہچان لیا جائے (اور پہچان سکتے ہیں صرف عقل مند لوگ) تو وہ زیادہ بڑھنے نہیں پاتے اور ان کو آسانی سے رفع کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر نادانی اور بے پرواہی سے انہیں بڑھنے دیا جائے یہاں تک کہ ہر شخص اپنی شناخت کر سکے تو پھر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل رومہ آنے والے خطروں کو دور سے تاڑ لیا کرتے تھے اور ان کا تدارک بھی وقت پر کر لیا کرتے تھے۔ وہ جنگ کو کچھ دنوں کے لئے ٹالنے کی غرض سے نقصان کبھی نہیں برداشت کرتے تھے۔ اس لئے کہ انہیں خوب معلوم تھا کہ ان ترکیبوں سے جنگ سے بچنا ممکن نہیں۔ جنگ کو صرف تھوڑے عرصہ کے لئے ٹالا جاسکتا ہے اور اس التوا سے اکثر دشمن ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے فلپ (۱) اور انیتوکس (۲) سے یونان میں جنگ کرنا بہتر سمجھا اور یہ انتظار نہ کیا کہ وہ اطالیہ پر حملہ آور ہوں۔ حالانکہ انہیں ان میں سے ایک سے بھی جنگ کرنے کی کوئی فوری ضرورت نہ تھی وہ چاہتے تو لڑائی ملتوی کر سکتے تھے مگر انہوں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ ایک قول جو ہمارے نئے سیاست دانوں کی زبان پر رہتا ہے یہ ہے "موجودہ مہلت سے

---

(۱) دوسری جنگ مقدونیہ میں ۲۰۰ تا ۱۹۷ ق۔م

فائدہ اٹھاؤ۔" مگر اہل رومہ کو یہ اصول کبھی نہ بھایا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی ہمت اور حکمت سے کام لینے کو ترجیح دی۔ وقت کا کچھ ٹھیک نہیں۔ اچھائی کے ساتھ برائی اور برائی کے ساتھ اچھائی وقت کے ہمراہ چلا کرتی ہے۔

آیئے اب ہم فرانس پر ایک نظر ڈالیں اور ہم نے جو اصول متعین کئے ہیں ان کی روشنی میں فرانس کی حالت کا مطالعہ کریں۔ چارلس ہشتم کا میں اس وقت تک ذکر نہیں کرتا۔ میرے پیش و نظر لوئز دوازدہم ہے جس کا قبضہ اطالیہ پر زیادہ عرصہ تک رہا اور اس وجہ سے اس کا طریق عمل زیادہ نمایاں ہے [1] ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ایک بیرونی مملکت کو اپنے زیر حکومت رکھنے کے لئے جو تدبیریں اختیار کرنی چاہیے تھیں ان پر اس نے عمل نہیں کیا اور ہر موقع پر الٹی تدبیریں اختیار کیں۔ اسی لوئز کو وینس والوں نے اطالیہ آنے کی دعوت دی تھی اور اہل وینس کی یہ آرزو تھی کہ اس کی مدد سے نصف لومبارڈی پر اپنا قبضہ جمایا جائے۔ میں اس مہم پر اعتراض نہیں کرتا اور نہ اس فیصلہ کو برا کہتا ہوں۔ شاہ لوئز کی خواہش یہ تھی کہ اطالیہ میں اپنے قدم جمائے مگر جب اس نے دیکھا کہ اس ملک میں کوئی بھی اس کا ساتھی نہیں (اس کے پیش رو چارلس نے اہل اطالیہ کے ساتھ جو بد سلوکیاں کی تھیں ان کی وجہ سے) اور سارے دروازے اس پر بند ہو گئے تو پھر اس کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جہاں بھی ممکن ہو لوگوں کو دوست بنائے اور یہ روش اس کی مشکلات کو حل بھی کر دیتی، اگر اس کے دوسرے انتظامات الٹ پلٹ نہ ہو جاتے۔ اس لئے کہ لومبارڈی

---

(۱) چارلس ہشتم کی اطالوی مہم ایک سال تک جاری رہی۔ ستمبر ۱۴۹۴ء سے اکتوبر ۱۴۹۵ء تک، لوئز دوازدہم ۱۴۹۹ء میں اطالیہ آیا اور ۱۵۱۲ء میں پاپائے رومہ جولیس دوم کے ساتھ جنگ میں ہارا تو اس کے اطالوی مقبوضہ علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔

کو زیر نگیں کرتے ہی وہ ساری عظمت اور ناموری جو چارلس نے گنوا دی تھی۔ لوئیز نے دوبارہ حاصل کرلی۔ جنوا نے اسکے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ فلورنس اس کی دوستی کا خواہاں ہوا۔ مارکوئیس آف مانتوا' ڈیوک آف فرارا' بنتی[1] ودلیو' مدام دے فورلی' فائنزا' پسورو' ریمینی' کامیرینو' پیومبینو کے فرماں روا اور لچیسی' پسانی ہنسی کی جمہوریتیں سب کے سب اتحاد اور دوستی کی غرض سے اس کی طرف رجوع ہوئے تب اہل وینس کو بھی اپنی حماقت کا اندازہ ہوا کہ لومبارڈری کے دو شہروں کی خاطر انہوں نے شاہ فرانس کو دو تہائی اطالیہ کا مالک بنوا دیا۔ [2] اب آپ ہی خیال فرمایئے کہ بادشاہ کس قدر آسانی سے اپنی عزت قائم رکھ سکتا تھا اگر وہ متذکرہ بالا اصولوں پر عمل کرتا۔ اپنے دوستوں کی حمایت کرتا جن کی تعداد بہت بڑی تھی۔ مگر جو کم زور اور خائف ہونے کی وجہ سے (بعض کو پاپائے روم کا خوف تھا اور بعض کو وینس والوں کا) ہمیشہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھے اور ان کی مدد سے وہ اپنے ہر مد مقابل کو نیچا دکھا سکتا تھا مگر اس نے میلان میں آتے ہی ایک پلٹا کھایا اور پوپ الگزنڈرا کو رومہ پر قبضہ جمانے میں مدد دی۔ [3] اس نے ذرا خیال نہ کیا کہ یہ اس کی کمزوری کا باعث بنے گا اور جو دوست اس کا دم بھرتے ہیں وہ اس سے ناخوش ہو جائیں گے اور کلیسا کا رتبہ بڑھ جائے گا اس لئے کہ کلیسا کی دینی طاقت پر جو پہلے ہی سے بہت زیادہ تھی دنیاوی قوت کا اضافہ ہو گا۔ ایک دفعہ جب یہ غلطی سرزد ہو گئی تو پھر وہ مقررہ راہ پر چلنے پر مجبور تھا۔ یہاں تک کہ وہ

---

(۱) مراد ہے ژیوداٸی بنتی ودلیو' شاہ بلونا۔

(۲) یہاں پر میکاویلی نے مبالغہ سے کام لیا ہے ۱۴۹۹ء عہد نامہ کی رو سے وینس کو سارا غیارادوا ملنا چاہیے تھا۔

(۳) سیزر بورژیا کو لوئز دوازدہم سے ۴۰۰۰ پیادہ فوج اور ۳۰۰ سوار ملے۔

دوبارہ اطالیہ آنے پر مجبور ہوا تاکہ پاپائے رومہ اگز نڈر کے حوصلوں کا خاتمہ کرے[1] اور اسے ٹسکنی کا مالک نہ بننے دے۔ پھر یہی نہیں کہ اس نے کلیسا کو فائدہ پہنچایا ہو نیپلس کو خوش کرنے کے لئے اس نے شاہ ہسپانیہ کو اپنا شریک بنایا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں پہلے تمام اطالیہ میں اس کا بول بالا تھا وہاں اس کا ایک شریک پیدا ہوگیا جس کی طرف اس صوبہ کے جاہ طلب افراد اور ایسے لوگ جو لوئز سے ناخوش ہوں بعض موقعوں پر رجوع کرسکتے تھے اور گو یہ امکان تھا کہ اس ملک کا بادشاہ اس کا وظیفہ خوار بن کر رہے[2] لیکن اس نے اسے نکال باہر کیا۔ اور اس کی جگہ ایک دوسرے بادشاہ کو دی۔ تاکہ یہ بادشاہ الٹا اسے نکال باہر کرسکے۔

یہ بالکل بدیہی اور قدرتی امر ہے کہ بادشاہوں کو اپنی قلمرو کو وسعت دینے کی خواہش ہوتی ہے۔ اور جب وہ صرف ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں جن کو حاصل کرنا ان کے لئے ممکن ہوتا ہے تو لوگ ان کی مدح و ثنا کرتے ہیں یا کم از کم برائی نہیں کرتے۔ مگر جب وہ ایسا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ان کے بس سے باہر ہو تو وہ قصوروار ٹھہرائے جاتے ہیں اور یہ کچھ بے جا بھی نہیں۔

پس اگر فرانس کے لئے تنہا نیپلس پر قابض ہونا ممکن تھا تب اور اگر اس کی اپنی قوت اتنی نہ تھی تب بھی اسے تقسیم پر راضی نہ ہونا چاہیے تھا۔ لومبارڈی میں اہل وینس کو شریک کرنے کی تو پھر بھی ایک وجہ تھی۔ اس لئے کہ اس سے فرانس کو اطالیہ میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ مگر نیپلس میں شاہ ہسپانیہ کو شریک کرنا تو خاص طور پر ناقابل معافی ہے کہ لومبارڈی کے برخلاف یہاں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح اطالیہ کی مہم میں لوئز سے پانچ خطائیں سرزد ہوئیں۔ اس نے کمزوروں کو تباہ و برباد کیا۔ اس

---

(۱) اصل میں اسے ہسپانیہ کے خلاف جنگ کی تیاری کی وجہ سے آنا پڑا۔
(۲) فریڈرک شاہ نیپلس اس پر آمادہ تھا کہ فرانس کی ماتحتی کو قبول کرلے۔

نے ایک پڑوسی بادشاہ کے قلم رو کو وسعت دی۔ اس نے ایک بدیسی کو وہاں بلایا جو قوت میں اس کے برابر تھا۔

اس نے ذاتی طور پر اطالیہ میں بود و باش اختیار نہ کی اور نو آبادیاں بھی نہ بسائیں۔ مگر شاید ان تمام غلطیوں کا خمیازہ اسے اپنی زندگی میں نہ بھگتنا پڑتا اگر اس نے ایک چھٹی غلطی نہ کی ہوتی یعنی وینس کی قوت کو دبانا [1] البتہ اگر اس نے کلیسا کا ساتھ نہ دیا ہوتا اور ہسپانیوں کو اطالیہ میں آنے نہ دیا ہوتا تو پھر اہل وینس کو نیچا دکھانا بالکل مناسب ہوتا۔ اور اگر اپنے دوسرے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا تھا تو پھر اہل وینس کو تباہ نہ ہونے دینا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ اگر اہل وینس کی قوت پورے طور پر برقرار رہتی تو وہ کسی اور کو لومبارڈی میں قدم نہ دھرنے دیتے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی فاتح اس پر راضی ہوتا کہ فتح کر کے وہ اسے ان کے حوالہ کر دے۔ اور بھلا کوئی کیوں لومبارڈی کو فرانس سے محض اس لئے چھینتا کہ اسے اہل وینس کی نذر کرے۔ باقی رہا فرانس اور اہل وینس دونوں سے لڑنا سو کسی کو اس کی ہمت نہ ہوتی۔ اگر کوئی یہ دلیل پیش کرے کہ شاہ لوئز نے جنگ سے بچنے کی خاطر روما کو پوپ کے حوالہ کیا اور وینس کی ریاست شاہ ہسپانیہ کو دے دی تو میرا جواب وہی ہے جو میں پہلے دے چکا ہوں۔ جنگ سے بچنے کی خاطر ناقابل اطمینان حالات کو جاری رہنے دینا ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ جنگ ہمیشہ کے لئے تو ٹلتی نہیں۔ صرف کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو جاتی ہے اور جب پیش آتی ہے تو اور بھی زیادہ دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ پاپائے رومہ سے اس نے مدد کا جو وعدہ کیا وہ دراصل صلہ تھا اس نے فسخ نکاح [2] اور روتن کے

---

(۱) ۱۵۰۸ء میں فرانس، پوپ، شہنشاہ اور اسپین نے اہل وینس کے خلاف ایک لیگ قائم کی جو کمبرائی کی لیگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیگ نے اہل وینس کو ۱۵۰۹ء میں شکست فاش دی۔

(۲) ۱۴۹۸ء میں لوئیز دوازدہم اور پوپ الکزانڈر ششم نے آپس میں یہ طے کیا کہ شاہ فرانس کا نکاح جو لوئیز یازدہم کی لڑکی سے ہوا تھا اور اسے پوپ فسخ کر دے تاکہ وہ چارلس ہشتم کی بیوہ این سے شادی کر سکے۔ اس کے بدلہ میں لوئیز دوازدہم نے پوپ کو روماتا پر قبضہ کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

آرچ بشپ کو کردال بنانے کا تو میں جو کچھ بعد میں بادشاہ کے وعدوں اور ان کے ایفا کے متعلق کہنے والا ہوں اس کی طرف توجہ منعطف کراؤں گا۔ عرض یہ کہ شاہ لوئز کے ہاتھ سے لومبارڈی نکل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا نہ ہوا جن کی بدولت دوسرے بادشاہ کامیابی کے ساتھ غیر علاقوں کو فتح کرتے اور ان پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ آئے دن ایسا ہوتا رہتا ہے اور نہ کچھ بلا سبب۔ خوب یاد آیا ایک دفعہ میری گفتگو اسی موضوع پر کردنال دامبا سے نانتے میں ہوئی تھی۔ وقت وہ تھا جب والنٹینونی (کہ عام طور پر پوپ الکزانڈر کا بیٹا سیزر بورژیا اسی نام سے پکارا جاتا تھا) رومانا پر قبضہ کیا۔ بحث کی گرماگرمی میں جب کردنال نے یہ کہا کہ اطالوی فن جنگ سے بالکل ناآشنا ہیں تو میں نے جواب دیا کہ فرانسیسی امور مملکت میں اسی طرح کورے ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی سیاسی معاملات کی سمجھ ہوتی تو کبھی کلیسا کو اتنی عظمت اور وقار نہ حاصل کرنے دیتے۔ [1] اب تجربہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اطالیہ میں کلیسا اور ہسپانیوں کی ساری شان و شوکت فرانس ہی کے طفیل میں ہے اور اس کا صلہ فرانس کو ملا، تباہی کی صورت میں۔

جو کچھ اب تک کہا گیا اس سے ایک کلیہ کا استنباط ہوتا ہے اور یہ کلیہ ایسا ہے جو مستثنیات سے بے خبر ہے یعنی یہ کہ دوسروں کی طاقت بڑھانا دراصل اپنی جڑ کاٹنے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ دوسروں کی ترقی ہوتی ہے یا تو مدد کرنے والے کے حسن تدبر سے یا قوت بازو سے۔ اور یہ دونوں بالآخر فروغ پانے والے کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔

---

(۱) لوئیز دوازدہم کا وزیر اعظم ۱۴۹۸ء میں کارڈینل بنا۔ نام تھا ژور ژ دامبا۔

باب ۴

دارا کی مملکت جسے سکندر نے فتح کیا' وہاں سکندر کی موت کے بعد اس کے جانشینوں کے خلاف علم بغاوت کیوں نہ بلند کیا گیا؟

اگر ان مشکلات کا خیال کیا جائے جو نئے فتح کیے ہوئے علاقوں کو قابو میں رکھنے میں پیش آتی ہیں تو اس بات پر اچنبھا سا ہوتا ہے کہ سکندر اعظم جو تھوڑے عرصہ میں تمام ایشیاء پر چھا گیا مگر جلد ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کی مملکت میں کہیں بھی بغاوت نہ ہوئی۔ اس کے جانشینوں نے ایک عرصہ تک ان تمام علاقوں پر چین سے حکومت کی۔ ان مصیبتوں کو تو جانے دیجئے جو خود ان کے حرص و طمع اور جاہ طلبی کا نتیجہ تھیں ورنہ انہیں نہ تو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور نہ ان کی کسی سے مڈ بھیڑ ہوئی بات یہ ہے کہ بادشاہتیں جن کا تھوڑا بہت حال ہمیں معلوم ہے ان پر حکومت کے دو علیحدہ علیحدہ طریقے تھے' ایک یہ کہ بادشاہ اپنے ملازمین کی مدد سے حکومت کرتا تھا۔ ملازمین میں سے وہ جسے چاہتا وزیر بناتا اور ریاست نظم و نسق میں ان سے مدد لیتا۔ دوسرا طریقہ وہ تھا جس میں حکومت بادشاہ اور جاگیرداروں کی ہوتی تھی۔ آخر الذکر بادشاہ کی عنایت نہیں بلکہ خاندانی قدامت اور اصالت کی بنا پر حکومت میں شریک ہوتے تھے۔ ان جاگیرداروں کی اپنی عملداری بھی ہوتی تھی اور اپنی رعایا کو بھی جو ان

کے حکم پر چلتی اور انکی عزت کرتی تھی۔ ایسی مملکتوں میں جن پر بادشاہ اور اس کے ملازمین کی حکومت ہوتی وہاں بادشاہ کا طوطی بولتا تھا۔ اس لئے کہ تمام مملکت میں سوائے اس کے اور کسی کی برتری مسلم نہیں ہوتی تھی اور اگر کسی اور کے حکم کی تعمیل ہوتی تھی تو بادشاہ کے وزیر یا نائب کی حیثیت سے' اس لئے نہیں کہ اس شخص سے کوئی خاص محبت ہوتی تھی۔

ان مختلف اقسام کی حکومتوں کی مثالیں ہمارے زمانہ میں ترکی اور فرانس میں پائی جاتی ہیں۔ پوری ترکی سلطنت پر ایک سلطان کی حکومت ہے اور جو بھی حکام ہیں وہ اس کے ملازم ہیں۔ پوری سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ (جنہیں **سنجق** کہا جاتا ہے) ان صوبوں میں وہ جب چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے مقرر کر دیتا ہے اور اپنی خوشی سے ان میں ادل بدل کرتا رہتا ہے۔ بر خلاف اس کے شاہ فرانس کو بہت سے بڑے بڑے جاگیردار چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ان افراد کا اقتدار مسلم ہے۔ اور ان کے خاندان کے ساتھ ایک مدت سے رعایا کو قلبی تعلق رہا ہے۔ اس وجہ سے انہیں ایک طرح کی فضیلت حاصل ہے۔ بغیر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے ہوئے بادشاہ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ پس اگر دونوں سلطنتوں کا موازنہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ترکی سلطنت کو زیر کرنا زیادہ مشکل ہے مگر ایک دفعہ فتح ہو جائے تو پھر اس پر قبضہ رکھنا نسبتاً" آسان ہونا چاہیے۔ فتح کرنا مشکل یوں ہے کہ غاصب کو ملک کے اندر بلانے والا کوئی نہیں اور اس کی مثال اس ملک کے افسروں سے کسی قسم کی مدد کا ملنا بھی قرین قیاس نہیں۔ اس کے اسباب میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ سرکاری افسر سب کے سب بادشاہ کے ملازم ہے اور ان پر بادشاہ کے ہزار احسان۔ پھر وہ کیوں کر آسانی سے خریدے جاسکتے ہیں۔ اور اگر وہ ہاتھ آ بھی جائیں تو اس سے کچھ حاصل نہیں اس لئے کہ ان کا کوئی ساتھ دینے والا نہ ہوگا پس جو کوئی ترکوں پر حملہ کرے اسے یاد رکھنا

چاہیے کہ پوری متحدہ قوم اس کا مقابلہ کرے گی۔ اسے اپنی قوت پر بھروسہ کرنا چاہیے نہ کہ ان کے باہمی نفاق پر۔ ہاں ایک مرتبہ ان پر غلبہ حاصل ہو جائے اور ان کی فوج کو پوری شکست ہو جائے یہاں تک کہ انہیں ایک رنگروٹ ڈھونڈے نہ ملے۔ تب سمجھنا چاہیے کہ خطرہ ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ پھر بس ایک شاہی خاندان کی طرف سے جو ڈر ہو گا سو ہو گا۔ اور اگر شاہی خاندان کو نیست و نابود کر دیا گیا تو پھر کوئی بھی نہ ہو گا جس سے قوم کو لگاؤ ہو۔ فتح سے پہلے تو لوگوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا فتح کے بعد ان کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہو گا۔ مگر جن ممالک میں فرانس کے نمونہ پر حکومت قائم ہو وہاں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر چند جاگیرداروں کو اپنی طرف کر لیا جائے۔ (اور یہ کچھ مشکل نہیں اس لئے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ ان میں سے بعض غیر مطمئن اور تبدیلی کے خواہاں نہ ہوں) تو پھر ملک میں فوراً" داخلہ ممکن ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' یہ لوگ آسانی سے داخلہ کا انتظام بھی کر سکتے ہیں اور ملک فتح کرنے میں مدد بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن جب مفتوحہ علاقہ کی مدافعت کرنے اور اس پر قبضہ رکھنے کا وقت آتا ہے تو پھر طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کی طرف سے بھی جنہوں نے آتے وقت مدد کی تھی اور ان کی جانب سے بھی جن کو فاتح کے آنے سے نقصان اٹھانا پڑے۔ پھر مقامی بادشاہ کی نسل کو نیست و نابود کرنا بھی کافی نہیں۔ اس لئے کہ دوسرے اکابر کو کیا کیجئے گا جو موقع کی تاک میں رہیں گے اور جب کوئی شورش برپا ہو گی تو وہ پیش پیش ہوں گے نہ انہیں راضی رکھنا سہل ہے اور نہ تباہ کرنا آسان۔ ایسی صورت میں ادھر بغاوت شروع ہوئی اور ادھر بوریا بستر سنبھالنے کی نوبت آئی۔

اب اگر دارا (۱) کی حکومت کی نوعیت پر غور کیا جائے تو وہ ترکوں کی حکومت

---

(۱) دارا سوم ۳۳۶ق م تا ۳۳۰ق م جس نے سکندر اعظم کے مقابلے میں شکست کھائی۔

سے بہت ملتی جلتی نظر آئے گی۔ اس لئے سکندر کو اس کے ساتھ جنگ میں پوری قوت صرف کرنی پڑی۔ لیکن جب فتح ہو گئی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد دارا کا انتقال بھی ہو گیا تو بیان کردہ اسباب کی بنا پر سلطنت ایران پر سکندر کی نہایت مستحکم حکومت قائم ہو گئی۔ اگر سکندر کے جانشین آپس میں متحد رہتے تو اطمینان کے ساتھ ایران پر حکومت کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ پوری قلمرو میں سوائے ان ہنگاموں کے جو خود ان کے جانشینوں کے پیدا کئے ہوئے تھے اور کوئی ہنگامے برپا نہیں ہوئے۔

لیکن مملکت فرانس کی مانند ہو تو ایسی پر امن حکومت نہیں۔ اسی سبب سے ہسپانیہ، فرانس اور یونان میں اہل رومہ کو آئے دن بغاوتوں کا سامنا رہتا تھا۔ ان ملکوں میں جب تک بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی رہی۔ اہل رومہ کو اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ البتہ جب سلطنت رومہ کی قوت اور زمانہ دراز تک اس سلطنت کے قیام کی بدولت یہ یاد دلوں سے مٹ گئی تو پھر اہل رومہ کے سوا اور کوئی حکومت کا دعویدار نہ رہا۔ بعد میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو ان صوبوں میں جس کا جہاں اثر تھا وہاں کی ایک جماعت کو اپنا شریک بنایا اور اسے میدان جنگ میں لا کھڑا کیا۔[1] وجہ یہ تھی کہ پرانے بادشاہوں کی نسل ختم ہو چکی تھی اور اب سوائے اہل رومہ کے اور کوئی تخت کا دعویدار نہ تھا۔ پس اگر ان باتوں کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوگی کہ سکندر تو ایشیا پر قابض رہا مگر دوسرے بادشاہ مثلاً "پیریوس وغیرہ کو اپنے مقبوضات برقرار رکھنے میں ہزار مشکلیں پیش آئیں۔ فاتحوں کے حسن تدبیر کی کمی یا زیادتی کا اس سے تعلق نہ تھا۔ اصل وجہ تھی حالات کا فرق۔

---

(۱) چنانچہ فرانس نے سیزر کا ساتھ دیا اور ہسپانیہ اور یونان نے پاپیس کا۔

باب ۵

حکومت ایسے شہروں اور مملکتوں پر جو فتح ہونے سے پہلے اپنے قوانین کے ماتحت رہے ہوں

نئی فتح کی ہوئی مملکتیں اگر آزادی کی خوگر ہوں اور خود ساختہ قوانین کے ماتحت رہ چکی ہوں انہیں قابو میں رکھنے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں بالکل تباہ و برباد کر دیا جائے۔ دوسری یہ کہ بادشاہ خود وہاں بود و باش اختیار کرے اور تیسری یہ کہ اگر تھوڑے سے روپے سے فاتح کی تسلی ہو جائے تو وہ یہ کر سکتا ہے کہ وہاں پرانے قوانین جاری رہنے دے۔ اور ان پر حکومت کرنے کے لئے ایک مجلس بنا دے جس میں چند ایسے افراد ہوں جو فاتح کے مفاد کا خیال رکھیں اور رعایا کو راضی اور تابعدار' یہ حکومت فاتح کی قائم کی ہوئی ہوگی اور اس کے اراکین کو یہ معلوم ہو گا کہ خود ان کی حیثیت فاتح کی مرہون منت ہے اور فاتح کی عنایت اور دلچسپی کے بغیر ان کی حکومت کی بقا ناممکن۔ اس لئے وہ فاتح کی عملداری برقرار رکھنے میں ہر طرح کی کوشش کریں گے۔ جو شہر ایک زمانہ تک آزاد رہا ہو' اسے قبضہ میں رکھنے کی سب سے زیادہ آسان ترکیب یہی ہے کہ اسی کے باشندوں سے مدد لی جائے ورنہ انتظام درہم برہم ہو جائے گا اہل

اسپارٹا[1] اور اہل رومہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اہل اسپارٹا نے ایتھنس اور تھیبز پر قبضہ کیا۔ تو اپنی پسند کے امراء کی حکومت قائم کی مگر اس کے باوجود دونوں شہر ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ [2] اہل رومہ نے کاپوا کارتھیج اور نمانیتہ کو قبضہ میں رکھنے کے لئے انہیں تباہ کیا اور اس طرح انہیں قبضہ میں رکھ سکے۔ بعد میں جب انہوں نے یونان پر قبضہ جمانے کے لئے اہل اسپارٹا کی تقلید کی اور اہل یونان کی آزادی اور قوانین برقرار رکھے تو انہیں ناکامی ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ کئی شہروں کو قبضہ میں رکھنے کے لئے پہلے انہیں تباہ کرنا پڑا۔ [3] اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یہی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہے جو کوئی کسی ایسے شہر کو فتح کرے جو آزادی کا مزہ چکھ چکا ہو اور اسے تباہ نہ کرے تو یہ اس کی بڑی بھاری غلطی ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ خود اس کی تباہی کی شکل میں نمودار ہونا لازمی ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کبھی شہری بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں تو وہ ہمیشہ اسی لفظ آزادی اور اپنے آباؤ اجداد کے قوانین کو لے کر اٹھتے ہیں جن کو نہ تو وقت بھلا سکتا ہے اور نہ ہی اچھا سلوک۔ ضروری ہے کہ ہر قسم کی احتیاط برتی جائے اور ہر قسم کا بندوبست۔ ایسے علاقوں کے باشندوں کو جس طرح بھی ہو متحد نہ ہونے دینا چاہیے۔ ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ منتشر رہیں اگر یہ نہ ہو تو ان میں پرانے حقوق کی یاد کبھی نہ مٹ پائے گی اور ہر موقع پر وہ ان حقوق کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش

---

(۱) پلوپونیسی جنگ کے بعد اہل اسپارٹا نے ایتھنس میں ۴۰۴ ق م میں ۳۰ جابروں کی حکومت قائم کی جسے ۴۰۲ ق م میں تردسی بوس نے برباد کیا۔

(۲) ۳۸۲ ق۔م میں اہل اسپارٹا نے تھیبز پر جو چند سری حکومت قائم کی اس کا خاتمہ ۳۷۹ ق۔م میں پہلو پیدس اور ایپامینڈس کے ہاتھوں ہوا۔

(۳) مثالیں ہیں کارنتھ کی تباہی (۱۴۶ ق۔م) ور تھیبز کی (۱۶۷ ق۔م)

کریں گے۔ پیسا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ [1] گو وہ مدتوں اہل فلورنس کے ماتحت رہا۔ مگر ان شہروں یا صوبوں کی حالت بالکل مختلف ہوتی ہے جو ایسے بادشاہ کے ماتحت رہے ہوں جن کی نسل نیست و نابود ہو چکی ہو۔ مانا کہ وفاداری ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ مگر جب پرانے شاہی خاندان کا ایک بھی رکن انہیں ڈھونڈھے نہیں ملے تو وہ کیا کریں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ آپس میں سے کسی ایک شخص پر متفق نہیں ہو پاتے اور بغیر بادشاہ کے وہ اپنے لئے آزادی کی زندگی ممکن نہیں خیال کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتے اور نیا بادشاہ انہیں آسانی سے خوش کر سکتا ہے۔ اور اس صورت میں ان کی طرف سے کامل اطمینان ہو سکتا ہے۔ مگر جمہوریتوں میں لوگوں میں زیادہ زندگی ہوتی ہے۔ قدیم آزادی کی یاد انہیں خاموش نہیں رہنے دیتی اور بھلا کیسے خاموش رہنے دے لہٰذا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی ہے کہ فاتح یا تو انہیں تباہ و برباد کر دے یا پھر انہیں میں بود و باش اختیار کرے۔

---

(۱) اہل فلورنس نے ۱۴۰۶ء میں پیسا کو بذریعہ خرید حاصل کیا لیکن بہت سی مصیبتوں اور جنگوں کے بعد اسے زیر کر پائے۔ ۱۴۹۴ء میں جب چارلس ہشتم نے اطالیہ پر حملہ کیا تو پیسا نے آزادی حاصل کر لی۔ ۱۵۰۹ء میں فلورنس نے دوبارہ پیسا کو فتح کیا۔

باب ۶

ان بادشاہتوں کے بارے میں جو اپنے حسن تدبر اور زور بازو سے حاصل کی گئی ہوں

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نئی حکومتوں کے بیان میں خواہ وہ .....
بادشاہتیں ہوں خواہ جمہوریتیں۔ میں بڑی بڑی عظیم الشان مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان اکثرانہیں راستوں پر گامزن ہوتا ہے جنہیں پہلے سے دوسرے اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ کوئی بڑا کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے پیش نظر نہ کوئی نمونہ ہوتا ہے۔ پوری پوری برابری نہ ہوسکے تو نہ ہو اور وہ کمال جس کے حاصل کرنے کی خواہش ہے نہ حاصل ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر عقل مند آدمی کا شیوہ یہی ہونا چاہیے کہ اپنے سامنے ایسی بڑی بڑی شخصیتوں کو بطور نمونہ کے رکھے جنہیں کسی بڑے کام میں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ اس غرض سے کہ اگر ان جیسا کمال نہ بھی حاصل ہو تب بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور رہو گا۔ تجربہ کار تیرانداز جب یہ دیکھتے ہیں کہ آماجگاہ بہت فاصلہ پر ہے تو چونکہ انہیں اپنی کمان کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیر کہاں تک پھینکتی ہیں' اس لئے وہ اپنا نشانہ ذرا اونچا باندھتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ انہیں اونچائی پر تیر پھینکنا مقصود ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس ترکیب سے تیر ٹھیک نشانے پر جاکر بیٹھتا ہے۔ چنانچہ ایسی مملکتوں کو قابو میں رکھنا جو حال میں کسی نئے بادشاہ نے حاصل کی ہوں۔

اس بادشاہ کی دانشمندی کے اعتبار سے کم یا زیادہ وقت طلب ہو گا معمولی حیثیت سے بڑھ کر بادشاہ بننا کوئی بات نہیں۔ اس کے لئے شرط ہے غیر معمولی اوصاف یا خوبی قسمت اور دونوں ہوں تو کیا کہنا۔ پھر مفتوحہ علاقہ کو قبضے میں رکھنا بہت آسان ہے مگر یاد رہے کہ کامیاب بادشاہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی قسمت پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کیا۔ بادشاہ کی دقتوں میں اس سے کمی ہو جاتی ہے اگر وہ دوسرے مقبوضات نہ ہونے کی وجہ سے نئی بود و باش اختیار کرنے پر مجبور ہو۔

جو بادشاہ اپنی خوش قسمتی کی بدولت نہیں بلکہ اپنی لیاقت کی بنا پر اس منصب تک پہنچے ان میں خاص طور پر مشہور اور افضل میری رائے میں یہ ہیں۔ حضرت موسیٰ' سائروس' رومولوس' تھیسیوس' وقس علی ہذا گو یہ مناسب ہو گا کہ حضرت موسیٰ کو ان میں شامل نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرانے آئے تھے۔ مگر نہیں' ان کا ذکر ضروری ہے اور نہیں تو اس وجہ سے کہ وہ ان اوصاف کے مالک تھے جن سے وہ خدائے تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے قابل ہوئے۔ لیکن اگر ہم سائروس کو لیں یا دوسرے فاتحوں اور سلطنتوں کے بانیوں کو تو معلوم ہو گا کہ وہ سب نہایت غیر معمولی انسان تھے۔ اور ہم ان کی زندگی اور کارناموں پر نظر دوڑائیں گے تو ان میں حضرت موسیٰ میں جن کا معلم خدائے برحق تھا کوئی خاص فرق دکھائی نہ دے گا اور ان کی زندگی اور ان کے اعمال پر نظر ڈالنے سے صرف یہی پتہ چلے گا کہ ان کی خوبی قسمت بس اتنی تھی کہ انہیں کام کرنے کا موقع ملا۔ جو مواقع ہاتھ آئے ان سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان موقع کے بغیر ان کی دماغی قوتیں رائیگاں جاتیں' لیکن ان میں قابلیت نہ ہوتی تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ اور وقت نکل جاتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے لئے ضروری تھا کہ بنی اسرائیل مصریوں کی غلامی اور مظالم کا شکار ہوں۔ ایسی صورت میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر انہیں حضرت موسیٰ کی

قیادت تسلیم ہو سکتی تھی۔ اسی طرح یہی مناسب تھا کہ رومولس البا میں نہ رہ پائے۔ اور پیدائش کے ساتھ ہی خطرات سے دوچار ہوتا کہ شہر رومہ کا بادشاہ اور بانی بن سکے۔ سائرس کے لئے ضروری تھا کہ اہل فارس میدیوں کی حکومت سے بیزار ہوں اور میدی ایک عرصہ سے امن و سلامتی کی زندگی گزارنے کی وجہ سے کمزور ہو چکے ہوں اور ان میں نسوانیت آچکی ہوں۔ اسی طرح تھیسیوس کو اپنے غیر معمولی اوصاف کے اظہار کا موقع نہ ملتا اگر اتھینہ کے لوگ غیر متحد اور منتشر نہ ہوتے۔ لیکن اگر ایک طرف خوبیٔ قسمت سے ان مشاہیر کو یہ مواقع ملے تو دوسری طرف انہوں نے ان مواقع سے اپنی قابلیت کی بدولت پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس سے ان کے وطن کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگے۔

مندرجہ بالا مشاہیر کی طرح جو لوگ بذریعہ شجاعت بادشاہت کے مرتبہ کو پہنچتے ہیں انہیں بادشاہت حاصل کرنے میں جو بھی دشواریاں پیش آئیں اسے قابو میں رکھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ بادشاہت کے حصول میں دقتیں یوں بھی پیش آتی ہیں کہ حکومت کی بنیاد رکھے اور اپنی حفاظت کے لئے وہ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ نئے قوانین جاری کریں۔ اور نئے ادارے قائم کریں اور جدتوں کا رواج دینا بہت ہی نازک امر ہے۔ اس راہ میں خطروں کی گنتی نہیں ہوتی اور اس میں کامیابی بہت ہی غیر یقینی ہے۔ ایسے بادشاہ کے وہ سب لوگ دشمن بن جاتے ہیں جو پرانے نظام کے ماتحت خوش حال تھے۔ رہے وہ جنہیں نئے نظام سے فائدہ پہنچتا ہے سو وہ اس کی مدافعت میں پوری پوری سرگرمی نہیں دکھاتے۔ اس سرد مہری کا سبب کچھ تو مخالفین کا خوف ہوتا ہے جنہیں قانون کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور دوسرے یہ لوگ اکثر نئی چیزوں پر اس وقت تک اعتقاد نہیں لایا کرتے، جب تک انہیں کچھ دنوں پرکھ نہ لیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نئے نظام کے مخالفوں کو موقع ملتا ہے وہ پوری قوت کے

ساتھ حملہ کرتے ہیں لیکن دوسرے لوگ مدافعت میں بے پرواہی سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنے ساتھ بادشاہ کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

اس مسئلہ پر پوری طرح بحث کرنا مقصود ہو تو پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ نئی طرز کے موجد خود اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں یا دوسروں کے دست نگر ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اپنے کام کو اختتام تک پہنچانے کے لئے انہیں منت سماجت کی ضرورت ہے یا استعمال کرنے کے لئے ان کے پاس طاقت ہے پہلی صورت میں ان کا حشر برا ہوا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں کرپاتے لیکن اگر ان کو اپنے اوپر بھروسہ ہے اور وہ طاقت سے کام لیتے ہیں تو شاید ہی کبھی ناکامی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ تمام مسلح پیغمبروں کو کامیابی نصیب ہوئی اور غیر مسلح پیغمبروں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے۔ عام طور پر لوگ متلون مزاج ہوتے ہیں۔ انہیں کسی چیز کی طرف مائل کرنا سہل سہی۔ مگر اس پر قائم رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی ہے کہ جب وہ ماننے سے انکار کریں تو انہیں زبردستی منوایا جائے اگر حضرت موسیٰ' سائروس' تھیسیوس اور رومولوس غیر مسلح ہوتے تو عرصہ تک اپنے احکام کی پابندی نہ کرا سکتے' جیسا کہ ہمارے زمانہ میں گیرولا مو سادونارولا [1] کے ساتھ پیش آیا۔ ادھر لوگوں کے یقین میں تزلزل آیا اور ادھر اس کے نئے اداروں کا خاتمہ ہوا۔ اس کے پاس ایسے ذرائع نہ تھے جن کی مدد سے وہ عقیدت مندوں کا یقین برقرار رکھ سکتا اور جو معتقد نہ تھے انہیں اپنے حلقہ ارادت میں لا سکتا چنانچہ اس قسم کے افراد کو اپنے کام کی تکمیل میں دشواری ہوتی ہے۔ ان کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ گو ان پر وہ اپنی قابلیت سے قابو پا سکتے ہیں۔ اور ایک دفعہ انہوں نے ان مشکلات پر قابو

---

(۱) ۱۴۹۸ء میں سادونارولا کو پوپ کے حکم سے فلورنس میں نذر آتش کیا گیا قصور؟ بدعتی ہونا۔

پالیا اور حاسدوں کو نیست و نابود کر دیا تو پھر ان کی قوت سلامتی' عزت اور مرفہ الحالی میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

جو بڑی بڑی مثالیں میں نے اوپر پیش کی ہیں ان میں ایک اور مثال کا اضافہ کرتا ہوں۔ یہ اتنی اہم نہ سہی مگر ہے اسی قسم کی۔ مثال بہترین ہے میری مراد سائراکوز کے بادشاہ ہیرو [1] سے ہے۔ یہ ایک معمولی شہری تھا۔ بڑھتے بڑھتے سائراکوز کا بادشاہ بن گیا۔ قسمت کا اس پر اتنا احسان تھا کہ اسے اپنے پورے جوہر دکھانے کا موقع دیا۔ اہل سائراکوز مظلوم تھے۔ انہوں نے ہیرو کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ پھر کیا تھا اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ اس کو بادشاہت سونپی گئی معمولی شہری تھا تب بھی بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ چنانچہ ایک ہم عصر مصنف لکھتا ہے کہ سوائے ملک کے اس کے پاس سبھی کچھ ہے جو بادشاہ کے پاس ہونا چاہیے اس نے پرانی فوج کو ایک طرف کر کے نئی فوج کی تنظیم کی۔ قدیم سیاسی اتحادوں کو ترک کیا اور نئے حلیف ڈھونڈ لئے۔ اسکی فوج بھی اپنی تھی اور ساتھی بھی اپنے ان بنیادوں پر وہ اپنی خواہش کے مطابق عمارت کھڑی کر سکتا تھا۔ اسے حکومت حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں مگر حکومت برقرار رکھنے میں ذرا بھی نہیں۔

---

(۱) ہیرو دوم ۳۰۶؟ تا ۲۱۴ ق۔ م یا ۲۶۸ ق۔ م میں سائراکوز کا بادشاہ بنا۔

باب ۷

نئی بادشاہتیں دوسروں کی مدد اور اپنی خوش نصیبی سے حاصل کی ہوئی

جو افراد معمولی حیثیت سے بڑھ کر بادشاہ بن جاتے ہیں انہیں حکومت حاصل کرنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن اسے قائم رکھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راستہ میں قدم بڑھاتے وقت کوئی بھی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی اور وہ اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ البتہ جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تب انہیں مشکلات آن گھیرتی ہیں۔ اس قسم میں وہ بادشاہ شامل ہیں جنہیں ریاستیں یا روپے کے بدلہ ملتی ہیں۔ یا عطا کرنے والوں کی نوازش سے چنانچہ یونان میں بارہا یہی ہوا آیونا اور ہیلز پانٹ کے شہروں میں دارا نے اپنی حفاظت اور عظمت کی خاطر بادشاہتیں قائم کیں۔ یہی مثال ان شہنشاہوں پر بھی عاید ہوتی ہے جو فوج میں خرابی پھیلا کر اس رتبہ کو پہنچے۔ اس طرح کے بادشاہوں کا دارومدار بس ان اشخاص کی خوشنودی اور خوش نصیبی پر ہوتا ہے جن کے طفیل میں بادشاہت حاصل ہوئی ہو اور یہ دونوں بہت غیر مستقل اور بے ثبات ہیں۔ ایسے بادشاہوں میں اس علم کی بھی کمی ہوتی ہے اور اس طاقت کی بھی جو اس مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے اگر بادشاہ غیر معمولی خوبیوں اور قابلیت کے مالک ہوں تب تو اور بات ہے ورنہ ان سے یہ توقع رکھنا ٹھیک نہیں کہ وہ ہمیشہ معمولی زندگی گزارتے رہنے کے باوجود

دوسروں پر حکومت کرنا جانتے ہوں گے۔ رہی طاقت تو ان کے پاس دوستانہ اور وفادار فوجیں نہیں ہوتیں۔

پھر عالم فطرت کی تمام اشیاء کی طرح جنہیں پیدا ہونے اور بڑھنے میں دیر نہیں لگا کرتی۔ جو مملکتیں یکایک معرض وجود میں آتی ہیں ان کی جڑیں کھوکھلی اور ان کے تعلقات غیر مستحکم ہوتے ہیں۔ وہ آندھی کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لاسکتے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ جنہیں قسمت کے زور سے اچانک بادشاہت ملے ان میں جلدی سے یہ سیکھنے کی قابلیت بھی پیدا ہو جائے کہ اس کو کیونکر برقرار رکھیں۔ اور اس مرتبے پر پہنچنے کے بعد وہ بنیادیں رکھیں جو دوسرے اس منزل پر پہنچنے سے پہلے ڈال چکے ہوتے ہیں۔

اب میں بادشاہ بننے کے ان دونوں طریقوں کی ایک مثال زمانہ قریب سے دیتا ہوں۔ یعنی ایک تو بہادری کے ذریعہ بادشاہ بننے کی اور دوسرے قسمت کی یاوری سے مثالیں ہیں۔ "فرانسسکو اسفورزا" اور "سیزارے بورژیا" کی۔ فرانسسکو مناسب ذرائع اختیار کر کے اور اپنی غیر معمولی حیثیت سے بڑھ کر میلان کا نواب (ڈیوک) بن گیا۔ حکومت حاصل کرنے کے لئے اسے خون پسینہ ایک کرنا پڑا مگر اسے برقرار رکھنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے "سیزارے بورژیا" کی مثال ہے۔ جسے عرف عام میں "ڈیوک والنٹینو" کہا جاتا ہے۔ اسے بادشاہت اپنے باپ کی بدولت ملی اور جب باپ کا زوال ہوا تو بیٹے کی بادشاہت بھی جاتی رہی۔ حالانکہ اس مملکت میں قدم جمانے کے لیے جو اسے کسی اور کی طاقت اور خوش نصیبی کی بدولت حاصل ہوئی تھی اس نے وہ سارے جتن کیے جو ایک دانش مند اور قابل شخص کر سکتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہ سب اس لئے ہوا کہ جو کوئی شروع میں

عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا اگر وہ غیر معمولی آدمی ہے تو ممکن ہے کہ بعد میں بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر اس میں معمار کو دقتیں پیش آئیں گی اور عمارت کے لئے خطرہ رہے گا۔ اب اگر ہم ان مختلف تدبیروں پر غور کریں جو ڈیوک والنٹینو نے اختیار کیں تو ہمیں ان بنیادوں کی وسعت کا اندازہ ہو گا جن پر وہ آئندہ اپنی قوت کی عمارت کھڑی کرنی چاہتا تھا۔

میرے خیال میں ان تدابیر پر غور کرنا ہرگز فضول نہیں۔ اس لئے کہ میری دانست میں نئے بادشاہ کے لئے اور کوئی نصائح ان سے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ اب رہا یہ کہ ان تدابیر سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ صرف اس کی غیر معمولی اور انتہائی بدنصیبی تھی۔

لکزانڈر ششم اپنے بیٹے ڈیوک کو بادشاہت دلانا چاہتا تھا۔ مگر راہ میں بہت سی فوری اور بعید دقتیں تھیں۔ پہلی دقت یہ تھی کہ اس کے خیال میں یہ ممکن نہ تھا کہ اسے کسی ایسے علاقے کا بادشاہ بنایا جائے جو کلیسا کے مقبوضات میں سے نہ ہو اور اگر وہ اس کے لئے کلیسائی علاقہ لیتا تو اسے یہ معلوم تھا کہ میلان کا ڈیوک اور اہل وینس جن کے ماتحت فائنزا اور ریمینی پہلے سے تھے اس پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھوں کے سامنے اطالیہ کے وسائل جنگ تھے۔ خاص طور پر وہ جن سے اسے مدد ملنے کا امکان تھا۔ مگر یہ وسائل ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھے جو پوپ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھے۔ مراد ہے آرسینی' کالومینسی [1] اور ان کے حالی موالیوں سے' ان پر اعتماد ممکن نہ تھا۔ پوپ کے لئے ضروری تھا کہ اس صورت حال کو یکسر بدل ڈالے اور اطالیہ کی مملکتوں کو کشت و خون میں مبتلا کرے تا کہ وہ کم از کم ان

---

(۱) روما کے بڑے جاگیردار

کے ایک حصے پر اطمینان سے قابض ہو سکے۔ یہ بات اس کے لئے اور بھی آسان ہو گئی جب اس نے اہل وینس کو بعض دوسرے اسباب کی بنا پر فرانسیسیوں کو دوبارہ اطالیہ میں لانے کی سازش کرتے پایا۔ نہ صرف اس منصوبے کی اس نے مخالفت نہ کی بلکہ شاہ لوئز کے پہلے نکاح کو فسخ کر کے اسے اور تقویت بخشی۔

چنانچہ ساہ لوئیز اہل وینس کی درخواست پر اور پوپ الکزانڈر کی مرضی سے اطالیہ میں داخل ہوا۔ وہ ادھر میلان پہنچا اور ادھر پوپ نے روماتا کے خلاف مہم کے لئے اس نے فوجی امداد حاصل کی اور صوبہ روماتا نے فرانسیسی طاقت کے رعب میں آکر فوراً" اطاعت قبول کرلی۔ اس طرح روماتا پر قبضہ کرنے اور کالومینسی کو شکست دینے کے بعد ڈیوک والنٹینو اس راستے پر آگے چلنا اور اپنے مقبوضات کو اور وسعت دینا چاہتا تھا۔ مگر دو باتوں نے اس کو روکا ایک تو اس کی اپنی فوجوں کی مشتبہ وفاداری اور دوسرے فرانس کی مخالفت' اسے خوف تھا کہ آرسینی کی افواج جن سے اس نے اپنا کام نکالا تھا کہیں اسے دھوکا نہ دیں اور نہ صرف اور مقبوضات حاصل کرنے میں رکاوٹ ڈالیں بلکہ الٹا اس سے وہ بھی نہ چھین لیں جو وہ حاصل کر چکا تھا۔ اور کہیں شاہ فرانس بھی ایسا ہی نہ کرے۔ آرسینی پر بھلا وہ کیسے بھروسہ کرتا جب کہ وہ دیکھ چکا تھا کہ فائنزا [1] پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس نے بولانا پر چڑھائی کی تو آرسینی نے مہم میں کتنی بے دلی کے ساتھ شرکت کی۔ شاہ فرانس کے دل میں جو کچھ تھا اسے بھی وہ اسی وقت خوب سمجھ گیا۔ جب اربینو [2] کی ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے لسٹکنی پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور جس سے لوئیز نے اسے روکا۔ اسی موقع پر ڈیوک نے پکا

(۱) ۲۵ اپریل ۱۵۰۱ء کا واقعہ ہے۔

(۲) ۱۲ اجون ۱۵۰۳

ارادہ کر لیا کہ وہ آئندہ دوسروں کی طاقت پر بھروسہ نہ کرے گا۔ اس نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ رومہ میں آرسینی اور کالومیسنی کے جتھوں کو کمزور کیا۔ ان کے پیرووں میں جو شرفا تھے انہیں اس طرح اپنے ساتھ ملایا کہ انہیں اپنے شرفا میں شریک کیا۔ انہیں معقول معاوضہ دیا اور ان کی لیاقت کے مطابق انہیں عہدے دیئے اور حکومت عطا کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں کے بعد ان کے جو تعلقات ان جماعتوں سے تھے وہ ختم ہو گئے۔ اور ان سب کی امیدوں کا مرکز بس ڈیوک بن گیا۔

پھر وہ آرسینی کے اکابر کا خاتمہ کرنے کے لئے موقع کی تاک میں رہا۔ خاندان کولونا کے اکابر کو تو پہلے ہی تتر بتر کر چکا تھا اور جب اچھا موقع آیا تو اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس لئے کہ آخر کار آرسینی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ڈیوک اور کلیسا کی عظمت ان کی تباہی کے مترادف ہے تو انہوں نے پروژیا کے علاقے کے اندر ماژیون [1] میں ایک کونسل منعقد کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آربینو میں بغاوت ہوئی' روماناً میں ہل چل مچی' ڈیوک کے لئے اور بھی بہتیرے خطرے پیدا ہو گئے۔ [2] مگر ان سب پر اس نے فرانس کی مدد سے قابو پا لیا۔ جب اس کی دھاک پھر سے بیٹھ گئی اور فرانسیسی یا دوسرے بیرونی امداد پر اسے بھروسہ نہ رہا تو اس خیال سے کہ کہیں کھلم کھلا مقابلہ نہ کرنا پڑے وہ داؤ پیچ پر اتر آیا۔ اس نے اپنی چالوں کو ایسی خوبی سے پوشیدہ رکھا کہ سنور پاولو [3] کے توسط سے (جس پر اس نے ہر قسم کے لطف و کرم کی بارش کی اور جسے خلعتیں' روپیہ اور گھوڑے سبھی کچھ عطا کئے) آرسینی کو راضی کر لیا یہاں تک

---

(۱) ۹ اکتوبر ۱۵۰۲ کو یہ واقعہ پیش آیا۔

(۲) اس کی افواج نے ۱۷ اکتوبر ۱۵۰۲ء کو آرسینی کے ہاتھوں شکست کھائی۔

(۳) پاولو ۲۵ اکتوبر ۱۵۰۲ء کو سیزارے بورژیا سے گفت و شنید کرنے کے لئے امولا آیا۔

کہ اپنی سادگی سے انھوں نے اپنے آپ کو سینی گالیا (۱) میں اس کے حوالے کر دیا۔ جب لیڈر ختم ہوگئے اور ان کے پیرو اس کے دوست بن گئے تو ڈیوک کی آئندہ عظمت کی کافی مضبوط بنیادیں پڑ گئیں۔ اس لئے کہ اربینو کے ساتھ ساتھ اس کے ماتحت روماناکا تمام علاقہ تھا۔ اور ان مملکتوں کی پوری آبادی کے دلوں میں اس نے گھر کر لیا تھا۔ خاص طور پر روما کے لوگوں کے دلوں میں' جو اب بہت خوش حال تھے۔

اس کے عمل کا ہر پہلو چونکہ خاص طور پر توجہ اور تقلید کے قابل ہے۔ اس لئے میں خاموشی کے ساتھ اس پر سے نہیں گزرنے کا۔ جب ڈیوک نے رومانا پر قبضہ کیا تو اس پر نالائق حکمرانوں کی حکومت تھی جن کے پیش نظر رعایا کا مفاد نہیں بلکہ جن کا مقصد رعایا کو لوٹنا تھا اور جو اتحاد کے بجائے نفاق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں آئے دن ڈکیتی' فساد اور ہر طرح کی زیادتیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں اس نے یہ طے کیا کہ ملک میں امن و امان قائم کرے۔ ملک کو مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اچھی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ اس نے مسزرا میرودور (۲) کو جو نہایت درشت اور مستعد آدمی تھا حاکم بنایا اور اسے کامل اختیارات تفویض کئے۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں نہایت کامیابی کے ساتھ ملک میں امن و امان قائم کر دیا لیکن جب بعد میں اسے یہ خوف ہوا کہ اتنے غیر محدود اختیارات سے نقصان کا اندیشہ ہے تو ڈیوک نے فیصلہ کیا کہ اس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی اور اس نے صوبہ کے مرکز میں ایک عدالتی مجلس ایک لائق صدر کے ماتحت قائم کی جس میں ہر شہر کو اپنے وکیل کے ذریعہ نیابت حاصل تھی۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ گذشتہ مظالم کی وجہ سے

---

(۱) ۳۱ دسمبر ۱۵۰۲ء کو یہ سب قتل کر دیئے گئے۔

(۲) اصل نام تھا ریمی گیمنس دے لورکوا۔

لوگوں میں اس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ اب اس کو دور کرنے کے لئے اور لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ ان پر جو زیادتیاں ہوئی تھیں ان کا ذمہ دار وہ خود نہیں بلکہ اس کا نائب تھا۔ اس بہانہ سے فائدہ اٹھاکر ایک دن اس نے رامیرو کا سر تن سے جدا کرا دیا۔ (۱) اور یہی نہیں بلکہ مع تختہ اور خون آلود کلہاڑی کے سزنیا میں اسے سربازار مشتہر کیا۔ عجیب وحشیانہ منظر تھا۔ جس سے عام لوگ مطمئن بھی ہوئے اور ہکے بکے بھی رہ گئے۔

آیئے اب پھر ہم اس مضمون کی طرف لوٹیں جس سے ہم نے آغاز کیا تھا۔ ایک وقت آیا کہ ڈیوک کافی طاقت ور اور ایک حد تک فوری خطروں سے محفوظ ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اس کے پاس اپنی پسند کی فوجیں تھیں۔ اور جن جن سے اسے قرب میں ہونے کی وجہ سے خطرہ ہو سکتا تھا وہ بڑی حد تک ختم کیے جا چکے تھے۔ اب غور کے قابل یہ بات تھی کہ اگر وہ مقبوضات کو بڑھانا چاہے تو شاہ فرانس کی جانب کیا رویہ اختیار کرے۔ اس لئے کہ یہ تو وہ خوب جانتا تھا کہ شاہ لوئیز سے جو اب اپنی غلطی اچھی طرح پہچان چکا تھا کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے نئے ساتھیوں کی تلاش شروع کی۔ اور فرانسیسیوں کے ساتھ جو نیپلس میں ہسپانیوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ اس لئے کہ ہسپانی گاتیا کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ دو رخی چال چلنے لگا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرانس کی طرف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرے۔ اور اگر الگزانڈر زندہ رہتا (۲) تو اسے اس میں جلد کامیابی بھی ہو جاتی۔

---

(۱) ۲۶ دسمبر ۱۵۰۲

(۲) جب اپریل ۱۵۰۳ء میں فرانسیسیوں کی اس جنگ میں جو وہ نیپلس کو تقسیم کرنے کے لئے ہسپانیہ کے خلاف لڑ رہے تھے شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا تو سیزارے بورژیا نے تسکنی حاصل کرنے کے لئے ہسپانیوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ۱۸ اگست ۱۵۰۳ء کو الگزانڈر ششم کا انتقال ہو گیا۔

موجودہ ملکی معاملات میں اس کی حکمت عملی وہ تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ رہا مستقبل کا مسئلہ تو اسے یہ ڈر تھا کہ ممکن ہے کلیسا کا نیا سردار اس کا دوست نہ ہو اور جو کچھ اسے الگز انڈر سے ملا تھا شاید اسے چھیننے کی کوشش کرے۔ اس کا کاٹ کرنے کے لئے اس کے خیال میں چار تجویزیں آئیں ایک ان رؤسا کے تمام رشتہ داروں کو جن کی جائیدادیں اس نے ضبط کرلی تھیں نیست و نابود کرنا۔ تاکہ پوپ کو مداخلت کا موقع ہی نہ ملے۔ دوسرے تمام شریف خاندان رومیوں کو اپنی طرف کرنا تاکہ جیسا کہ کہا جاچکا ہے ان کی مدد سے پوپ کی روک تھام کی جاسکے۔ تیسرے بڑے پادریوں کی مجلس (کالج آف کارڈنیلس) کو اپنے تحت لانا۔ اور چوتھے اپنے والد کی موت سے پہلے اپنی حکومت اس طرح مستحکم کرنا کہ پہلے وار کا تن تنہا مقابلہ کرسکے۔

جب الگز انڈر کی موت واقع ہوئی تو ان چار مقاصد میں سے تین پورے ہوچکے تھے اور چوتھا بس پورا ہوا چاہتا تھا۔ جن رؤسا کی جائیدادیں اس نے غصب کی تھیں۔ ان میں سے جن جن تک اس کی پہنچ ہوئی انہیں اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور بہت ہی تھوڑے بچ پائے۔ رومی شرفاء کو اس نے اپنے ساتھ ملالیا اور بڑے پادریوں کی مجلس میں اکثریت کو اپنا حامی بنالیا۔

جہاں تک مزید فتوحات کا تعلق ہے وہ تسکنی پر قابض ہونا چاہتا تھا پروژیا [1] اور پیوم بینو پر تو اس کا قبضہ ہو ہی چکا تھا اور پیسا کو بھی وہ اپنی حفاظت میں لے چکا تھا [2] اور اب چونکہ فرانس کی اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس لئے کہ فرانسیسیوں کو ہسپانوی نیپلس سے نکال چکے تھے اور اس طرح دونوں اس کی دوستی حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ پیسا پر کود پڑا جب پیسا لے لیا تو لکا اور سینا کو سر تسلیم خم کرنا یقینی

---

(۱) ۶جنوری ۱۵۰۳ء سے

(۲) ۱۵۰۳ء سے

تھا۔ کچھ تو اہل فلورنس سے نفرت کی وجہ سے اور کچھ ان کے خوف کے سبب۔ اور اہل فلورنس کی حالت کا ناگفتہ بہ ہونا لازمی تھا۔

پس اگر اسے ان منصوبوں میں کامیابی ہوتی جیسا کہ اس سال ہو رہی تھی جس سال الگزانڈر کا انتقال ہوا تو اس کی طاقت اور شہرت اتنی بڑھ جاتی کہ پھر وہ اپنے بل بوتے پر اپنی جگہ سنبھال سکتا تھا اور دوسروں کی فوجوں اور اپنے مقدر پر اس کا دارومدار نہ ہوتا۔ مگر سیزارے بورڑیا کو تلوار میان سے نکالے پانچ ہی برس ہوئے تھے کہ الگزانڈر کا انتقال ہو گیا۔ [۱] جبکہ صرف روماناکی مملکت کا ٹھیک ٹھور ہو پایا تھا۔ اور باقی سب علاقے اتھل پتھل تھے اور اس پر غضب یہ کہ نہایت ہی طاقتور فوجوں کے درمیان گھرے ہوئے [۲] اور حد درجہ بیمار و نزار۔ تاہم ڈیوک ایسے جوش و خروش اور ہمت و عزم والا انسان تھا اور اس سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ لوگوں کو یا تو کسی طرح راضی اور خوش رکھنا چاہیے یا انہیں بالکل پیس کر رکھ دینا چاہیے۔ نیز اس مختصر سے عرصے میں اس نے ایسی استوار بنیادیں ڈالیں تھیں کہ اگر یہ فوجیں اس کا پیچھا کرنے کے لئے نہ ہوتیں' یا پھر اس کی صحت بہتر ہوتی تو وہ ضرور ہر مشکل پر غالب آتا۔

جو بنیادیں اس نے ڈالی تھیں۔ اس کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روما نے ایک مہینے سے زیادہ اس کا انتظار کیا۔ اور نیم مردہ ہونے پر بھی روما میں کوئی

---

(۱) اصل میں ۱۴۹۹ء کے آخیر میں سیزارے بورڑیا نے یہ جنگ شروع کی تھی گو وہ اگست ۱۴۹۸ء میں ڈیوک بن گیا تھا الگزانڈر ششم کی موت اگست ۱۵۰۲ء میں واقع ہوئی۔

(۲) ایک طرف گائیتا میں ہسپانوی افواج تھیں اور دوسری طرف روما میں فرانسیسی لشکر۔

اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ حالانکہ بالیونی [1]، وتیلی اور آرسینی اس پر حملہ کرنے کے لئے آئے۔ مگر کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ اور چاہے وہ اپنی پسند کے مطابق کسی کو پوپ نہ بنوا سکتا ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی پوپ منتخب ہو سکے۔ اگر الگزانڈر کی موت کے وقت اس کی صحت اچھی ہوتی تو پھر اس کے لئے سب کچھ آسان تھا۔ جس روز جولیس دوئم پوپ منتخب ہوا [2] اس روز سیزار لے بورژیا نے خود مجھ سے کہا کہ اس نے ان تمام صورتوں پر غور کیا تھا جو اس کے باپ کی موت کے وقت پیش آسکتی تھیں اور ان سب کے مقابلے کے لئے تدابیر سوچ رکھی تھیں۔ مگر جو چیز پہلے سے اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی وہ یہ تھی کہ جب اس کے باپ کا انتقال ہو گا تو وہ خود بستر مرگ پر دراز ہو گا۔

ڈیوک کے ان تمام کاموں پر نظر ڈالی جائے تو وہ قصور وار نہیں ٹھہرے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے خیال میں تو مناسب ہو گا کہ اگر جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ اسے ان سب بادشاہوں کے سامنے بطور نمونہ کے رکھا جائے جو اپنی خوش قسمتی سے اور دوسروں کی امداد سے اس مرتبہ تک پہنچے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی اعلیٰ ہمت اور بلند حوصلگی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ وہی کرے جو اس نے کیا۔ اور اگر اسے اپنے منصوبوں میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس کی وجہ صرف اس کے باپ کی کم عمری اور اس کی اپنی بیماری تھی۔ بس جو کوئی نیا بادشاہ بنے اور اس کا مقصد ہو دشمنوں کا قلع قمع کرنا، دوستوں کو خوش کرنا، زور سے یا چالبازی سے اپنا سکہ جمانا، رعایا کے دلوں میں اپنا خوف اور محبت

---

(۱) پروژیا پر ان کی حکومت تھی۔

(۲) ۲۷ اکتوبر ۱۵۰۳ء سے میکاویلی روما میں فلورنس کا سفیر تھا جولیس دوم یکم نومبر ۱۵۰۳ء کو پوپ

دونوں بٹھانا۔ سپاہیوں کو مطیع و فرمانبردار بنانا' جو اسے نقصان پہنچانے کے قابل یا کسی سبب سے اسے نقصان پہنچانے کے خواہش مند ہوں ان کو نیچا دکھانا' پرانے نظام کو بدل کر نئے نظام کی بنیاد ڈالنا' سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی کرنا۔ دریا دلی اور فیاضی سے کام لینا۔ غیر وفادار فوجوں کو تباہ و برباد کر کے نئی فوجیں بھرتی کرنا' بادشاہوں اور رئیسوں سے اس طرح تعلقات رکھنا کہ وہ اگر مدد کریں تو پورے جوش و خروش کے ساتھ اور اگر مخالفت کریں تو احتیاط سے' تو اس مقصد کے لئے اس شخص کے کاموں سے بڑھ کر قابل تقلید مثال ملنا مشکل ہے۔

اس کا قصور صرف ایک تھا جولیس دوم کا پوپ کی حیثیت سے منتخب ہونا اس کا یہ انتخاب ٹھیک نہ تھا جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ وہ اپنی مرضی کا پوپ منتخب نہ بھی کرا سکتا تھا تو کم از کم وہ جسے نہ چاہتا اسے منتخب ہونے سے روک سکتا تھا اور اسے ایک ایسے بڑے پادری کو پوپ کبھی نہیں بننے دینا چاہیے تھا جسے وہ نقصان پہنچا چکا تھا۔ یا جو پوپ بننے کے بعد بجا طور پر اس سے خائف ہوتا۔ اس لئے کہ خوف اسی قدر خطرناک دشمن ہے جس قدر ناراضگی۔ جن کو اس نے ناراض کیا تھا۔ ان کے نام علاوہ اوروں کے یہ ہیں۔ سان پیترو اودنچولا [1]۔ کولان [2] سان ژیارژویو [3] اور اسچانیو' جو باقی رہے ان میں سے دامبوئزلے اور ہسپانوی کردنالوں کے علاوہ ہسپانوی کردنال تعلقات اور احسانات کی وجہ سے اور روئن اس کی قوت کی وجہ سے جو اسے فرانسیسی قصر شاہی سے تعلقات کی بنا پر حاصل ہوئی' اور سب پوپ بننے کے بعد بجا طور پر اس سے

---

(۱) اصل نام تھا ژیولیانو دیلاردویرا جو بعد میں پوپ جولیس دوم کے لقب سے مشہور ہوا۔

(۲) اصل نام رفانیلو یا یودی سوونا۔

(۳) اس کانیو اسفورا ابن گیان گالیازو' میلان کے سابق ڈیوک کا بیٹا۔

خائف ہوتے۔ ڈیوک کو اولا" ہسپانوی پوپ بنوانے کی کوشش کرنی چاہیے تھے۔ اس میں ناکامی ہوتی تو چاہیے تھا کہ روئن کے انتخاب پر راضی ہو جائے۔ بہر صورت سان پیترو اونچولا کے انتخاب پر کبھی راضی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو کوئی یہ سمجھے کہ بڑے لوگ موجودہ احسانات کی وجہ سے پرانی شکایتیں بھلا دیتے ہیں وہ دھوکے میں ہیں۔

اس انتخاب میں ڈیوک نے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا اور یہی غلطی آخر میں اس کے زوال کا باعث بنی۔

باب ۸

ان اشخاص کے بارے میں جو جرم کا ارتکاب کرکے بادشاہ بنے ہوں

خانگی حیثیت سے ترقی کرکے بادشاہ بننے کی دو صورتیں ایسی ہیں جن میں سے ایک بھی پورے طور پر شجاعت یا تقدیر کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے مناسب ہو گا اگر یہاں پر میں ان کا ذکر کروں۔ گو ان میں سے ایک پر جمہوریتوں کے تحت زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث ہو سکتی ہے۔

جو صورتیں میرے پیش نظر ہیں وہ یہ ہیں ایک وہ جب بادشاہت شرارت اور ارتکاب جرم سے حاصل کی جائے۔ اور دوسری وہ جب کوئی شخص دوسرے شہریوں کی عنایت سے بادشاہ بنے۔ میں پہلے طریقے کو دو مثالوں سے واضح کروں گا۔ ایک مثال زمانہ قدیم سے لی گئی ہے اور دوسری زمانہ جدید سے، میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ جو کوئی ان مثالوں پر عمل کرنا چاہے گا اس کے لئے مختصر ساذکر بھی کافی ہے۔

صقلیہ کا اگیستھو کلیز[۱] نہ صرف یہ کہ شاہی خاندان سے نہ تھا بلکہ وہ جن لوگوں میں سے تھا وہ یوں ہی تھے 'ایرے غیرے نتھو خیرے' یہ شخص ایک کمہار کا بیٹا

---

(۱) شاہ سانزا کوزا ز ۲۱۷ ق۔ م موت ۲۸۹ ق۔ م میں واقع ہوئی۔

تھا۔ اور اس کی زندگی طرح طرح کی برائیوں کا مجموعہ تھی لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی دماغی اور جسمانی خوبیاں تھیں کہ جب اس نے سپاہیانہ زندگی اختیار کی تو معمولی سپاہی کی حیثیت سے ترقی کر کے سائراکیوز کا سپہ سالار بن گیا۔ جب یہ حیثیت مستحکم ہو گئی تو اس نے بادشاہ بننے کی دل میں ٹھان لی اور جو کچھ اسے دوسروں کی رضا و رغبت سے ملا تھا اسے اپنی قوت سے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ کسی کا اس پر احسان نہ رہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے ہامل کار کار تھیجی (1) سے جو صقلیہ میں اپنی فوجوں کو لے کر جنگ کر رہا تھا سمجھوتا کر لیا۔ ایک دن اس نے سائراکیوز کے لوگوں اور مجلس امراء کو جمع کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے جمہوریت کے معاملات پر ان سے گفتگو کرنی تھی۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو مقررہ اشارہ پر سپاہیوں نے تمام امراء کو اور عوام میں سے سب سے زیادہ دولت مند لوگوں کو قتل کر دیا۔ جب ان سب کا خاتمہ ہو گیا تو اس نے شہر کی حکومت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لی اور بغیر جھگڑے فساد کے حکومت کرتا رہا اور گو اسے دو دفعہ اہل کار تھیج نے شکست دی اور آخر میں وہ محاصرہ میں پھنس گیا۔ لیکن اس نے نہ صرف کامیابی کے ساتھ اس شہر کی مدافعت کی بلکہ اپنی فوج کے ایک حصے کو اس کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر' دوسرے حصے سے افریقہ پر حملہ آور ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں سائراکیوز کا محاصرہ اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ اہل کار تھیج ایسی مصیبت میں مبتلا ہوئے کہ انہیں مجبوراً" اگاتھوکلیز سے معاملہ کرنا پڑا صقلیہ کو انہوں نے اس کے حوالے کیا اور خود افریقہ کے قبضہ پر اکتفا کیا۔

پس جو کوئی اس شخص کے کاموں اور غیر معمولی ذہانت پر نظر ڈالے گا اسے شاید ہی کوئی چیز نظر آئے جو تقدیر کی طرف منسوب کی جا سکے۔ اس لئے کہ اس نے جو

---

(1) ہامل کار بار کاز کے آباؤ اجداد میں سے تھا

کچھ عظمت حاصل کی اس کے لئے وہ کسی اور کا رہین منت نہیں تھا بلکہ اس نے خود باقاعدہ طور پر فوجی پیشہ میں یہ عظمت حاصل کی۔ اس کے حصول میں ہزار دشواریاں پیش آئیں اور اسی طرح حاصل ہونے کے بعد بھی اسے طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ساتھی شہریوں کو قتل کرنا' دوستوں کو دھوکا دینا' اپنا اعتبار کھو بیٹھنا' رحم نہ کرنا اور مذہب کو خیرباد کہنا کوئی تعریف کی بات نہیں۔ ان ذرائع سے سلطنت مل جائے تو ملجائے ناموری حاصل نہیں ہوا کرتی لیکن اگر اس ہمت پر غور کیا جائے جس سے آگاتھوکلیز نے خطروں کا مقابلہ کیا اور ان پر غالب آیا۔ اور اس استقلال کو دیکھا جائے کہ اس نے کس طرح مشکلات کو برداشت کیا اور ان پر فتح پائی تو پھر کوئی وجہ نہ ہوگی کہ اس کی بھی ہی اتنی ہی عزت نہ کی جائے جتنی کہ کسی مشہور سے مشہور سپہ سالار کی۔ تاہم اس کا انتہائی ظلم اور بے رحمی اور اس کے بے شمار جرائم اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اسے عظیم ترین شخصیتوں میں شمار کیا جائے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم تقدیر یا استحقاق کی جانب وہ منسوب کریں جو اس نے بغیر ان دونوں کے حاصل کیا۔

ہمارے اپنے زمانے کی ایک مثال ہے جب الگزانڈر ششم پوپ تھا تو فرمو کا باشندہ اولیور تیو چند سال پیشتر یتیم ہوچکا تھا۔ اس کی تربیت اس کے ماموں ژیووانی فوژلیانی نے کی۔ اسے بچپن ہی میں پاولو دیتلی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ اس مشہور سپہ سالار کے ماتحت اچھی طرح فن جنگ سیکھ لے اور پھر فوج میں کوئی اعلیٰ عہدہ حاصل کرسکے۔ پاولو کے انتقال کے بعد [1] وہ اس کے بھائی وتیلوزو کے ماتحت کام کرتا رہا۔ آدمی ذہین' بے باک اور ثابت قدم تھا تھوڑی ہی مدت میں اس کا شمار اپنی فوج کے

---

(۱) پیسا کے خلاف اہل فلورنس نے جو جنگ کی اس میں یہی ان کی افواج کا سپہ سالار تھا مگر بعد میں اس پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور یکم اکتوبر ۱۴۹۹ء کو اسے موت کی سزا دی گئی۔

بہترین سپاہیوں میں ہونے لگا مگر وہ چونکہ دوسروں کی ماتحتی کو اپنی کسر شان سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ ترکیب سوچی کہ وتیلیشی کی حمایت اور فرمو کے بعض ایسے شہریوں کو سازش میں شریک کر کے جو اپنی ملک کی حمایت اور فرمو کے بعض ایسے شہریوں کو سازش میں شریک کر کے جو اپنی ملک کی آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس شہر پر قبضہ جمائے۔ چنانچہ اس نے ژیووانی فوژلیانی کے نام ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا تھا کہ وطن سے مدتوں دور رہنے کے بعد اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ پھر ایک مرتبہ اس سے ملے اور اپنے وطن مالوف کی زیارت کرے نیز اپنی موروثی ملک کو ذرا دیکھے بھالے اور چونکہ اب تک اس کی بس ایک ہی کوشش رہی تھی، یعنی نام پیدا اس لئے اسکی خواہش ہے کہ وہ عزت کے ساتھ وطن میں داخل ہو اس طرح کہ اس کے احباب اور پیروؤں میں سے ایک سو اس کے ہمراہ آئیں تاکہ ہم وطنوں کو یہ اندازہ ہو کہ اس نے اپنا وقت فضول نہیں گنوایا۔ اس نے ژیوانی سے یہ بھی التجا کی کہ وہ براہ کرم ایسا انتظام کرے کہ فرمو کے شہری عزت و احتشام کے ساتھ اس کا استقبال کریں کہ اس استقبال سے نہ صرف اس کی بلکہ اس کے ماموں کی بھی عزت ہوگی جس نے اس کو پالا پوسا تھا۔

چنانچہ ژیوانی نے ہر طرح اپنے بھانجے کی خاطر مدارت کی اور شہریوں سے بھی خوب آؤ بھگت کرائی۔ اور اپنے ہی پاس ٹھہرایا۔ اولیورتیو نے کچھ روز تو اس کے ساتھ قیام کیا۔ اور اسی زمانہ میں جب اپنے بدارادہ کو پورا کرنے کے انتظامات کر لئے تو ایک نہایت ہی پر تکلف دعوت کی جس میں اپنے ماموں اور فرمو کے تمام اکابر کو بلایا۔ جب کھانا ہو چکا اور حسب موقع خاطر تواضع ختم ہوئی تو اولیورتیو نے ایک چال چلی۔ پوپ الگزانڈر اور اس کے بیٹے سیزار کی عظمت اور ان کی مہموں کا ذکر چھیڑ کے اس کے موضوع سخن کو بالکل بدل دیا۔ ژیووانی اور بعض اور اشخاص اس کی بات کا جواب دے رہے تھے کہ وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یہ معاملات ایسے ہیں کہ ان پر

گفتگو علیحدگی میں ہونے چاہیے۔ اس نے ایک دوسرے کمرے کا رخ کیا ماموں اور دوسرے شہری اس کے پیچھے ہولئے وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہی تھے کہ سپاہی جو پیچھے انتظار کر رہے تھے آن کودے اور ژیووانی اور باقی سب کو تہ تیغ کر ڈالا۔

اس قتل و خون کے بعد اولیوریتو نے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوکر پورے شہر کا چکر لگایا اور صدر مجسٹریٹ کو محل میں بند کر دیا۔ مجبوراً" لوگوں نے ڈر کر اس کی اطاعت قبول کرلی اور اس حکومت کو تسلیم کیا جس کا وہ خود سردار بنا۔ جو جو ناراضگی کی بنا پر اس کے راستے میں حائل ہو سکتے تھے انہیں اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا نئے نئے ملکی اور فوجی فرمانوں کے ذریعہ اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔ اس طرح کہ اس کی حکومت کے زمانہ میں جو ایک سال تک قائم رہی وہ خوفرمو میں نہ صرف محفوظ بلکہ اپنے تمام ہمسایوں کے دل میں اس کا خوف طاری ہو گیا۔ اسے اپنی جگہ سے ہٹانا اتنا مشکل ہوتا جتنا اگاتھوکلیز کو اگر جیسا کہ پہلے ہی کہا جاچکا ہے۔ اس موقع پر جب سیزارے بورژیا نے سینی گالیا میں آرسینی اور ویتلی کو گرفتار کیا ہے وہ سیزارے بورژیا کی چال میں نہ آجاتا۔ یہاں وہ بھی پھنس گیا۔ ماموں کو قتل کیئے ہوئے سال بھر ہوا تھا کہ وہ ویتلوزو کے ساتھ جو بہادری کے کاموں اور بڑے کاموں میں اس کا پیشوا تھا' پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اگاتھوکلیز اور بعض اسی قسم کے لوگ باوجود ہزار دھوکے فریب اور مظالم کے مدتوں چین سے اپنے ملکوں پر حکومت کرتے رہے اور بیرونی دشمنوں سے بھی اپنی مدافعت کرتے رہے اور کسی نے چوں نہ کیا۔ برخلاف اس کے بعض دوسرے افراد اپنے ظلم کی وجہ سے اپنی حیثیت امن وامان کے زمانے میں بھی قائم نہ رکھ سکے۔ چہ جائیکہ جنگ کے خطرناک زمانے میں۔ اس کا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ ظلم کا بھی محل ہوتا ہے اگر بری باتوں کی تعریف ممکن ہو تو میں کہوں گا کہ ظلم اس صورت میں برمحل ہے جب بس ایک دفعہ اپنی حفاظت کی خاطر روا

روا رکھا جائے اور بعد میں اس سے اجتناب کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو محکوم کے حق میں اس رویہ کو بدلا جائے۔ برخلاف اس کے بے جا زیادتیاں وہ ہیں جو شروع میں چھوٹے پیمانے پر ہوں مگر وقت کے ساتھ ان میں کمی کی جگہ..... اضافہ ہوتا جائے جو پہلے طریقہ کار پر کاربند ہوتے ہیں ان پر گر خدا کی مہربانی اور بندوں کی نوازش ہو تو اگاتھوکلیز کی طرح انہیں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر جو دوسرے طریقہ کار پر کاربند ہوں ان کا خدا ہی حافظ ہے۔

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب کوئی غاصب کسی مملکت پر قبضہ کرلے تو اسے یہ طے کرنا چاہیے کہ کون کون سے مظالم ناگزیر ہیں۔ اسے چاہیے کہ جو ظلم کرنا ہو بس ایک دفعہ کر ڈالے تاکہ بار بار اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔ روز روز ظلم نہ ہو گا تو لوگوں میں بھروسہ پیدا ہو گا اور اگر نہیں نفع پہنچے گا تو وہ دوست بن جائیں گے جو کوئی اس اصول پر عمل نہیں کرے گا۔ یہ چاہے اپنی کم ہمتی کے سبب سے ہو اور چاہے دوسروں کے کہنے سننے کی بناء پر اس کے ہاتھ ہمیشہ خون آلود رہیں گے نہ وہ اپنی رعایا پر اعتبار کرسکے گا اور نہ رعایا کو اس سے لگاؤ پیدا ہو گا۔ یہ سب مسلسل اور پے در پے مظالم کی وجہ سے نقصان پہنچانا ہو تو چاہیے کہ ایک دفعہ پہنچادے۔ بدمزگی دیر تک نہ رہے گی تو غصہ کی آگ بھی زیادہ نہ بھڑکنے پائے گی اور عنایتیں کرنا ہوں تو تھوڑی تھوڑی۔ تاکہ ان کا ذائقہ دیر تک قائم رہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بادشاہ کے تعلقات رعایا کے ساتھ ایسے ہوں کہ چاہے جیسے بھی انقلابات ہوں اچھے یا برے اس کے رویے میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ اس لیے کہ اگر بادشاہ پر برا وقت آن پڑنے سے تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی تب سختی کرنے کا وقت نہیں رہے گا۔ رہی نرمی سو وہ ٹھکرادی جائے گی۔ اس وجہ سے کہ اسے مجبوری پر محمول کیا جائے گا اور لوگ بادشاہ کا ذرا بھی احسان نہ مانیں گے۔

باب ۹

قومی بادشاہت

اب میں اور طرح کی شخصیت سے بحث کروں گا یعنی اس سربر آوردہ شہری سے جو جرم و تشدد کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے ساتھی شہریوں کی مہربانی سے اپنے ملک کی بادشاہت حاصل کرے۔ اسے قومی بادشاہت کہا جاسکتا ہے اور اس کا حصول نہ تو محض غیر معمولی لیاقت پر مبنی ہوتا ہے اور نہ خوش نصیبی پر۔ یہ مبنی ہوتا ہے دانشمندی اور مقدر دونوں کے مجموعے پر۔ پھر یہ ہے کہ یہ بادشاہت ملتی ہے یا تو قوم کی عنایت سے یا شرفا کی مہربانی سے۔ اس لئے کہ ہر شہر میں دونوں مخالف جماعتیں موجود ہوتی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ قوم کی خواہش ہوتی ہے کہ شرفاء اس پر حکومت اور زیادتی نہ کریں۔ اور شرفاء یہ چاہتے ہیں کہ قوم پر حکومت کریں اور اسے ستاتے رہیں یہ دونوں خواہشیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے نتیجہ کے طور پر ان تین صورتوں میں سے ایک ظہور میں آتی ہے۔ بادشاہت یا جمہوریت یا نراج۔

بادشاہت کو ظہور میں لاتی ہے یا تو قوم یا جماعت شرفاء۔ یہ اس پر موقوف ہے کہ ان میں سے کسے موقع ہاتھ آیا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب شرفاء یہ دیکھتے ہیں کہ قوم کا مقابلہ ممکن نہیں تو پھر وہ اپنے میں سے ایک کو آگے کرتے ہیں اور پھر اسی کو بادشاہت سونپ دیتے ہیں تاکہ اس کی بدولت انہیں اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع ملے۔ اس طرح جب قوم اپنے آپ کو شرفاء کے مقابلے میں بے بس محسوس کرتی ہے تو وہ بھی اپنے آپ میں سے ایک کو اچھالتی ہے۔ اور اسے بادشاہ بنادیتی ہے تاکہ اس کے اختیارات

سے قوم کی مدافعت ہو۔

جو کوئی اپنی بادشاہت کے لئے شرفاء کا رہین منت ہوتا ہے اسے اس شخص کے مقابلے میں جسے قوم نے بادشاہ بنایا ہو۔ اپنی بادشاہت برقرار رکھنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اسی کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جو اس کی ہمسری کرتے ہیں۔ ان پر وہ نہ تو حسب منشاء حکومت کر سکتا ہے اور نہ ان کو قابو میں رکھ سکتا ہے لیکن جو قوم کی امداد سے اس رتبہ تک پہنچے اس کا مد مقابل کوئی نہیں ہوتا اور اس کے ارد گرد ایسے اشخاص یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں یا بہت کم ہوتے ہیں جنہیں اس کی اطاعت سے گریز ہو۔

ایک بات اور بھی ہے۔ انصاف پسندی کے ساتھ اور دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر شرفاء کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قوم کو مطمئن کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ قوم کا مقصد شرفاء کے مقصد سے نیک تر ہوتا ہے۔ شرفاء ظلم کرنا چاہتے ہیں اور قوم اپنے آپ کو ظلم سے صرف بچانا چاہتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قوم اگر ناراض ہو تو تخت و تاج کا برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ قوم کی تعداد اتنی بڑی ہوتی ہے ہاں شرفاء سے مقابلہ ہو تو مدافعت ممکن ہے۔ اس لئے کہ ان کی جماعت گنتی کے چند افراد پر مشتمل ہوتی ہے قوم بادشاہ سے ناراض ہوگی تو جو بد ترین سلوک کرے گی وہ یہ ہے کہ وہ بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ مگر شرفاء ناراض ہوں گے تو نہ صرف ساتھ چھوڑ دیں گے بلکہ علم بغاوت بلند کریں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ ان معاملات میں زیادہ دور اندیش بھی ہوتے ہیں اور زیادہ ہوشیار بھی۔ اس لئے وہ ٹھیک وقت پر ایسی ترکیبیں کر لیتے ہیں جن سے وہ خود بھی محفوظ ہو جاتے ہیں اور آنے والے حاکم کے فیوض سے مالا مال بھی۔ پھر یہ ہے کہ بادشاہ کا قوم کے ساتھ عمر بھر کا سابقہ ہوتا ہے اور شرفاء کے ساتھ

تعلقات عارضی ہوتے ہیں۔ان کا بنانا اور بگاڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔جب چاہا اختیارات عطا کر دیئے اور جب چاہا چھین لئے۔

اس مسئلہ کو میں ذرا اور واضح کرنا چاہتا ہوں۔شرفاء' شرفاء میں فرق ہے دو راستوں میں سے وہ ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔یا تو ان کا مفاد بادشاہ کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔یا ایسا نہیں ہوتا جن کا مفاد اپنے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو اور جو حرص و ہوس کے بندے نہ ہوں ان کی عزت کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے جن کا مفاد اپنے مفاد کے ساتھ وابستہ نہ ہو اس کے ساتھ دو رویوں میں سے ایک رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔اگر ان کے طرز عمل کی وجہ ان کی کم ہمتی یا طبیعت کا بودا پن ہے تو ان سے اپنا کام نکالنا چاہیے خاص طور پر جو عاقل و دانا ہوں۔ کامیابی کے دور میں ان کی وجہ سے عزت میں اور چار چاند لگیں گے اور مصیبت کے زمانے میں ان سے کسی قسم کا خوف نہ ہو گا لیکن اگر وہ جاہ طلبی کی وجہ سے یہ رویہ اختیار کریں تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ انہیں بادشاہ سے زیادہ اپنا خیال ہے۔ایسوں سے بادشاہ کو چوکنا رہنا چاہیے۔ان سے اسی طرح ڈرنا چاہیے جیسے کھلے دشمنوں سے اس لئے کہ جب اس پر پتا پڑے گی تو وہ نقصان پہنچانے میں دریغ نہ کریں گے۔

جو شخص قوم کی مدد سے بادشاہت حاصل کرے اسے چاہیے کہ قوم کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے۔یہ کچھ مشکل بھی نہیں۔لوگ تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ ان پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔مگر جو کوئی قوم کی مرضی کے خلاف اور شرفاء کی مہربانی سے بادشاہ بنا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کو منائے۔اس میں اسے فوری کامیابی ہو گی بشرطیکہ وہ قوم کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لے۔اس لئے کہ لوگ جب کسی سے بدی کی توقع رکھیں اور ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کریں تو انہیں اپنے محسن سے قریبی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔وہ جلد ہی بادشاہ کے بہی خواہ بن جاتے ہیں بمقابلہ اس کے جس کو ان کی

بدولت بادشاہت نصیب ہوئی ہو۔ لوگوں کو رام کرنے کے ہزار طریقے ہیں۔ یہ طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اس لئے اس کے متعین قاعدے نہیں بیان کئے جاسکتے۔ چنانچہ میں انہیں نظرانداز کرتا ہوں۔ مگر ایک بات میں پھر کہوں گا بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ قوم کو اپنا دوست بنائے ورنہ مصیبت کے وقت ایک بنائے نہ بنے گی۔

•• اسپارٹا کے بادشاہ نابس [1] پر پورے یونان نے دھاوا بولا' اور ظفرمند رومی افواج نے حملہ کیا۔ ان کے مقابلے میں اس نے اپنے ملک کی مدافعت اور اپنے تاج کی حفاظت کی۔ جب یہ خطرہ سامنے آیا تو رعایا میں ایسے افراد کی تعداد بہت ہی مختصر تھی جن سے اسے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ عام طور پر لوگ مخالف ہوتے تو کام نہ چلتا۔"

میرے قول کو کوئی اس پرانی کہاوت کا حوالہ دے کر رد کرنے کی ناکام کوشش نہ کرے۔ کہ "قوم پر اعتماد کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریت پر دیوار کھڑی کرنا۔" اس لئے کہ ممکن ہے یہ قول ایسے شہری کے حق میں ٹھیک ہو جس کا حکومت سے تعلق نہ ہو جس کا دارومدار قوم کی نوازش پر ہو اور جو یہ امید رکھتا ہے کہ جب دشمن یا حکام اسے دبائیں گے تو لوگ اسے آکر بچالیں گے۔ ایسی صورت میں انسان اکثر دھوکا بھی کھاسکتا ہے۔ جیسا گراچی (۲) کے ساتھ روما میں پیش آیا اور میسر ژیور ژیواسکالی کے ساتھ فلورنس (۳) میں مگر جب قوم سے توقعات باندھنے والا کوئی بادشاہ جو جس میں حکم دینے کی صلاحیت ہو' جو آلام و مصائب کے آتے ہی جی نہ چھوڑ بیٹھتا ہو اور جو ایک طرف

(۱) سپارٹا کا جابر بادشاہ ۲۰۵ تا ۱۹۲ ق۔ م
(۲) سپارٹا کا جابر بادشاہ ۲۰۵ تا ۱۹۲ ق۔ م
(۳) ۱۷ جنوری ۱۳۸۰ء کو اسے موت کی سزا دی گئی۔

اپنی جرات اور طرز عمل سے ساری جماعت میں جان ڈالتا ہو تو دوسری طرف ہر طرح کی قابل عمل تدبیریں بھی اختیار کرتا ہو۔ ایسے شخص کو لوگ دغا نہیں دیتے اور یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ اس نے جو توقعات باندھ رکھی تھیں وہ بے جانہ تھیں۔

اس قسم کی بادشاہوں کے لئے خطرہ کا موقع اس وقت ہوتا ہے جب سول حکومت مطلق حکومت میں بدلتی ہے اس لئے کہ اس قسم کے بادشاہ حکومت یا تو خود کرتے ہیں یا حکام کے ذریعہ۔ دوسری صورت میں ان کی حکومت مقابلتاً "کمزور اور غیر مستحکم ہوتی ہے اس لئے کہ اس کا دارومدار کلی طور پر ان شہریوں پر ہوتا ہے جو حکام بنائے جاتے ہیں اور جو بے چینی کے زمانے میں حکومت کا نہایت آسانی سے خاتمہ کر سکتے ہیں۔ سازش سے یا کھلم کھلا سرکشی اور ان ہنگاموں میں بادشاہ کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ اپنے مطلق اختیارات کو کام میں لائے۔ شہری اور رعایا تو عادی ہوتے ہیں حکام سے احکام پانے کے۔ بھلا اس شور و شغب میں بادشاہ کی کون سنتا ہے غرض ایسے مشکل زمانے میں ان لوگوں کی تعداد بہت ہی مختصر ہوتی ہے جن پر بادشاہ بھروسہ کر سکے۔ امن و امان کے زمانے میں جب شہریوں کو ریاست کی ضرورت ہوتی ہے بادشاہ جو کچھ مشاہدہ کرے وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس لئے کہ ہر شخص اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ لوگ لمبے چوڑے وعدے کر لیتے جب جان دینے کا موقع نہیں ہوتا تو ہر شخص یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بادشاہ کی خاطر جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے مگر جب اس کا وقت آتا ہے اور مملکت شہریوں کی محتاج ہے۔ تب کوئی سامنے نہیں آتا۔ یہ تجربہ خاص طور پر اس وجہ سے بھی خطرناک ہے کہ یہ ایک ہی دفعہ کیا جا سکتا ہے اس لئے دانشمند بادشاہ کو ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ رعایا ہر طرح کے حالات میں مملکت اور بادشاہ کو اپنے لئے ضروری سمجھے کہ ایسی صورت میں اسکی وفاداری پائیدار ہوگی۔

باب ۱۰

مختلف بادشاہتوں کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے کا طریقہ

ان بادشاہتوں کی خصوصیات کی تحقیقات کے سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے وہ یہ کہ بادشاہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ بوقت ضرورت وہ محض اپنے ذاتی وسائل کو کام میں لاکر اپنے کام نکالے یا وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہے مجھ کو اسے اور اچھی طرح واضح کرنے دیجئے۔ میرے خیال میں وہ بادشاہ اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں جن کے پاس بے شمار آدمی اور بے انتہا دولت ہو جس کی مدد سے وہ اتنی بڑی فوج تیار کر سکیں جو ہر حملہ کرنے والے سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو اور وہ بادشاہ میری نظر میں ہمیشہ دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں جو مرد میدان نہیں۔ بلکہ جنگ کے موقع پر فصیلوں کے پیچھے اپنی حفاظت کی فکر کرتے ہیں پہلی قسم پر بحث کی جاچکی ہے اگر ضرورت ہوئی تو پھر اس کا تذکرہ کروں گا۔ دوسری قسم کے بارے میں کام کی بات بس اتنی ہے کہ ایسے بادشاہوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ اپنے شہروں میں ہر طرح کا سامان فراہم کریں اور ان کی مدافعت کا انتظام کریں۔ رہا ملک کا بقیہ حصہ سو اس کو خدا پر چھوڑیں۔ جو بادشاہ اپنے شہر کی اچھی طرح قلعہ بندی کرے گا اور رعایا کے لئے وہ تمام انتظام کرے گا جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں اور جن کا میں بعد میں بھی اکثر ذکر کروں گا تو دوسرے بادشاہ اس پر حملہ کرنے میں خاص احتیاط برتیں گے اس لئے کہ انسان ایسی مہم کی ذمہ داری

مشکل سے اپنے اوپر لیتا ہے جس میں دقتیں صاف نظر آرہی ہوں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کوئی بادشاہ اچھی طرح شہر کی قلعہ بندی کرے اور رعایا بھی اس سے نفرت نہ کرتی ہو تو اس پر حملہ کرنا سہل کام نہیں۔

جرمنی کے شہر بالکل آزاد ہیں آس پاس کا بہت تھوڑا سا علاقہ ان کے ماتحت ہے اور جب انہیں اس میں فائدہ معلوم ہوتا ہے تو وہ شہنشاہ کی اطاعت کرتے ہیں مگر انہیں نہ تو شہنشاہ کا خوف ہے اور نہ کسی اور قریبی ریاست کا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی اتنی اچھی طرح قلعہ بندی ہوئی ہے کہ ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ ان پر حملہ بہت تھکا دینے والا اور کٹھن ہو گا اسے نظر آتا ہے کہ ان شہروں کے چاروں طرف مناسب خندقیں اور فصیلیں ہیں۔ ان کے پاس معقول توپ خانے ہیں اور ان کے سرکاری گوداموں میں ہمیشہ ایک سال کے لئے کھانے پینے کا سامان اور ایندھن جمع رہتا ہے اور اس کے علاوہ لوگوں کو چپ چاپ رکھنے کی خاطر اور اس لئے کہ ان کی طرف سے ریاست کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے وہ ہمیشہ سال بھر کے لئے ایسی اشیائے خام جمع کر لیتے ہیں جن سے ان کے لئے کام مہیا کیا جا سکے۔ ایسے کام جن میں ان شہروں کی زندگی اور قوت پنہاں ہے اور جن پر عوام کا دارومدار ہے علاوہ بریں وہ فوجی قواعد بھی کرتے رہتے ہیں اور اسے جاری رکھنے کے لئے بہت سے قوانین بنائے ہیں۔

پس جس بادشاہ کے پاس ایک مستحکم شہر ہو اور لوگ اس سے نفرت نہ کرتے ہو اس پر حملہ نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی حملہ کرے گا تو حملہ کرنے والوں کا سرنیچا ہو گا حالات زور بدلتے رہتے ہیں اور پورے ایک سال تک فوج کی بغیر کسی رکاوٹ کے میدان جنگ میں ڈالے رکھنا تقریباً" ناممکن ہے شاید کوئی یہ کہے کہ جب لوگ دیکھیں گے کہ ان کی جائیداد جو شہر کی فصیل سے باہر ہے نذر آتش ہو رہی ہے تو اُن سے کیسے چپ چاپ بیٹھا جائے گا محاصرہ کی طوالت اور ذاتی مفاد کی وجہ سے وہ بادشاہ کو بھول

جائیں گے۔ جواب یہ ہے کہ ایک طاقت ور اور باہمت بادشاہ ان سب دقتوں کو سر کر سکے گا کبھی اپنی رعایا کو یہ امید دلا کر کہ بس اب مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اور کبھی انہیں دشمن کی سفاکی کا خوف دلا کر اور اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے بچا کر جو اس کی نظر میں خاص طور پر بے باک ہوں گے۔

ایک اور بات ہے۔ آنے کے فوراً بعد جب کہ لوگوں کے دلوں میں گرمی باقی ہوگی اور وہ ملک کو بچانے کے لئے تیار ہوں گے دشمن ملک میں ہر طرف آگ لگا دے گا اور اس کو تباہ و برباد کر دے گا اس وقت پس و پیش کرنے کے کیا معنی۔ جب کچھ عرصہ بعد مزاج میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے گی جو نقصان ہونا تھا سو ہو چکا ہو گا اور جو آفتیں آنی تھیں وہ آچکی ہوں گی۔ اور اب ان کی کوئی تلافی ناممکن نہ ہوگی۔ ان حالات میں لوگ اس پر ضرور آمادہ ہو جائیں گے کہ اپنے بادشاہ کے ساتھ اتحاد کر لیں۔ اس لئے کہ وہ بظاہر ان کا احسان مند نظر آئے گا یوں یوں کہ اس کی مدافعت میں ان کے گھر بار جل کر خاک ہو گئے اور ان کے مقبوضات تباہ و برباد۔ اپنی اور اپنے ساتھ کی ہوئی نیکی دونوں کے بندھن میں انسان جکڑا ہوا ہے کہ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ پس اگر ہر بات کا ہر طرح خیال رکھا گیا تو بادشا کے لئے یہ کچھ مشکل نہ ہو گا کہ اپنی رعایا کے حوصلے بڑھائے رکھے۔ شرط اتنی ہے کہ سامان رسد کی کمی نہ پڑنے پائے اور مدافعت اچھی طرح ہو۔

✪ ❑ ✪

باب ۱۱

مذہبی بادشاہتیں

اب بس مذہبی بادشاہتوں کا ذکر باقی ہے۔ یہاں جتنی بھی دقتیں ہیں وہ سب حصول سے پہلے پیش آتی ہیں۔ مذہبی بادشاہت ملتی تو ہے لیاقت سے یا خوبی قسمت سے مگر اسے برقرار رکھنے کے لئے دونوں میں سے ایک بھی ضروری نہیں وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہتی ہے۔ ان پرانے مذہبی احکام کی وجہ سے جو نہایت ہی کارگر ہیں اور بادشاہ کچھ بھی کریں اور کیسی ہی زندگی گزاریں ان کو اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ بادشاہوں میں یہی بادشاہ ایسے ہیں جنہیں اپنی بادشاہت کی مدافعت کی ضرورت نہیں۔ ان کی رعایا ہوتی ہے مگر وہ ان پر حکومت نہیں کرتے۔ ان مملکتوں کی کوئی خاص حفاظت نہیں کی جاتی مگر پھر بھی وہ ان سے نہیں چھنتیں۔ اور گو رعایا پر حکومت نہیں ہوتی مگر رعایا کو اس کی کیا پرواہ۔ اور نہ رعایا کے دل میں بادشاہ سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوئی خواہش ہوتی ہے۔ محفوظ اور خوش حال زندگی کچھ انہیں مملکتوں کا حصہ ہے۔ مگر وہ اسی طاقت کی مدد سے قائم و برقرار رہتی ہیں جن تک انسانی دماغ کی رسائی نہیں۔ میں ان کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ ان کی عزت خدا کی طرف سے ہے اور ان کا قائم رکھنے والا بھی خدا ہی ہے۔ ایسی مملکتوں سے بحث کوئی نہایت گستاخ اور عاقبت اندیش شخص ہی کر سکتا ہے۔

تاہم اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آخر کلیسا کو دنیاوی امور میں اتنی عظمت کیسے حاصل ہوئی۔ خاص طور پر جب یہ معلوم ہو کہ اگزانڈر سے پہلے تمام اطالوی بادشاہ

(نہ صرف وہ جو بادشاہ کہلائے بلکہ تمام نواب اور جاگیردار' خواہ کتنے ہی ادنیٰ درجہ کے کیوں نہ ہوں)کلیسا کی دنیاوی طاقت کو بہت ہی حقیر سمجھتے رہے ہیں۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ شاہ فرانس [۱] اس سے کانپتا ہے اسی نے شاہ فرانس کو اطالیہ سے نکلوا دیا [۲] اور اہل وینس کو برباد کیا۔ [۳] بات اظہر من الشمس ہے مگر اسے یاد دلانا غالباً" بے سود نہیں۔

شاہ فرانس' چارلس کے اطالیہ میں قدم دھرنے سے پہلے یہ ملک پاپائے رومہ' شاہ نیپلس' اہل وینس' ڈیوک آف میلان اور راہل فلورنس کے زیر حکومت تھا۔ ان فرماں رواؤں کو دو فکریں لاحق تھیں ایک یہ کہ کوئی بدیسی ہتھیاروں سے مسلح اطالیہ میں داخل نہ ہونے پائے اور دوسرے آپس میں سے کوئی بھی کسی نئے علاقے کو اپنے زیر حکومت نہ لائے۔ خاص طور پر پاپائے رومہ اور اہل وینس کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔ اہل وینس کی روک تھام کرنے کے لئے باقی سب اتحاد اسی طرح ضروری تھا جس طرح فرارا [۴] کی مدافعت کے لئے اور پوپ کو دبائے رکھنے کے لئے انہوں نے رومہ کے جاگیرداروں سے کام لیا۔ یہ جاگیردار دو فرقوں میں منقسم تھے۔ آرسینی اور کالو نتنی۔ اس لئے جھگڑے کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ موجود رہتا تھا۔ وہ پوپ کی آنکھوں کے سامنے اپنے لئے اسلحہ مہیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ پوپ کی کمزوری اور عدم تحفظ کی۔

---

(۱) پوپ جولیس دوم کا زمانہ

(۲) بذریعہ "مقدس لیگ" ۱۵۱۲ء

(۳) "کمبرائی لیگ" کے ذریعہ ۱۵۰۸ء

(۴) ۱۴۸۲ء میں یہ اتحاد قائم ہوا۔ ارکان تھے پاپائے رومہ' نیپلس اور میلان۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس عہدہ پر کوئی باہمت پوپ فائز ہوا۔ مثلاً "سکٹس (1) مگر باوجود اپنی دانائی اور اور خوش قسمتی کے وہ بھی ان الجھنوں سے آزاد نہ ہوسکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پاپاؤں کی سرکاری زندگی مختصر ہوتی تھی۔ اوسط کوئی دس سال ہوتا ہوگا اور اس عرصہ میں کسی ایک فرقہ کو بھی مشکل سے نیست و نابود کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر ایک پوپ فرقہ کالو نسی کو قریب قریب ختم کر بھی لے تو اس کے بعد دوسرا پوپ آئے گا۔ جس کی دشمنی آرسینی سے ہوگی۔ آرسینی سے نجات حاصل کرنا تو اس کے بس کی بات ہوگی نہیں۔ البتہ کالو نسی کی تباہی ناتمام رہ جائے گی اور وہ دوبارہ زندہ ہوجائیں گے اسی سبب سے اطالیہ والوں کی نظر میں پاپاؤں کی دنیاوی طاقت کو ذرا بھی قدر نہیں تھی۔ بعد میں الگزانڈر ششم (۲) بر سر اقتدار آیا اس وقت تک جتنے پوپ گزرے تھے ان میں بس یہی ایک شخص تھا جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ دولت اور اسلحہ کی مدد سے پوپ کس طرح اپنا سکہ جما سکتا ہے۔ ایک تو ڈیوک دالنٹینو کے ذریعہ دوسرے فرانسیسیوں کے آنے سے فائدہ اٹھا کر اس نے وہ تمام کامیابیاں حاصل کیں جن کا بیان میں ڈیوک کے کارناموں کے سلسلے میں کر چکا ہوں اور گو اس کا مقصد کلیسا کو نہیں بلکہ ڈیوک کے مرتبے کو بڑھانا تھا مگر اس نے جو کچھ کیا اس سے کلیسا کی عظمت بڑھی اور اس کی موت اور ڈیوک کی تباہی (۳) کے بعد کلیسا ہی نے اس کی تمام کوششوں سے فائدہ اٹھایا۔

---

(۱) سکٹس چہارم ۱۴۷۱ تا ۱۴۸۴

(۲) سکٹس چہارم ۱۴۷۱ تا ۱۴۸۴ء

(۳) جولیس دوم نے سیزارے سے بورژیا کو اس وقت تک قید میں رکھا جب تک پورے رومانا سے اس کا عمل دخل نہ اٹھ گیا ۱۵۰۴ء پھر اس نے ہسپانیہ کی راہ لی اور ۱۵۰۷ء میں فیانا کے محاصرہ میں کام آیا۔

پھر پوپ جولیس کی باری آئی۔اب کلیسا طاقت ور تھا۔اس کے پاس روماناکا پورا علاقہ تھا۔روماکے جاگیرداروں کی طاقت ختم ہوچکی تھی اور اگزانڈر کی مار پیٹ کی بدولت فرقہ بندیاں ٹوٹ کر برابر ہوچکی تھیں۔اس کے لئے روپیہ جمع کرنے کی بھی ایسی راہیں کھلی ہوئی تھیں جن پر اگزانڈر سے پہلے کبھی کوئی پوپ گامزن نہیں ہوا تھا۔ان باتوں میں جولیس نے نہ صرف اگزانڈر کی پیروی کی بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ گیا۔اس کا ارادہ تھا کہ بلونا کو فتح کرے۔اہل وینس کو تباہ کرے اور فرانسیسیوں کو اطالیہ سے نکال باہر کرے۔ان تمام مہموں میں اسے کامیابی ہوئی اور یہ خاص طور پر قابل تعریف اس وجہ سے ہے کہ اس نے کسی ایک شخص کو نہیں بلکہ کلیسا کے ادارے کو زیادہ طاقتور بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔اس نے کالونلسی اور آرسینی فرقوں کو بھی جن حدود کے اندر پایا تھا ان سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔یہ صحیح ہے کہ انہیں شورش کرنے کا خیال پیدا ہوا مگر اس نے دو چیزوں کا انتظام بہت اچھی طرح کیا ایک کلیسا کی عظمت جس سے اس نے ان کے دلوں میں دہشت پیدا کی اور دوسرے اس نے انہیں کبھی اپنے کردنال نہیں بنانے دیئے جو بدامنی کا اصل سبب تھے۔اگر ان فرقوں کے اپنے کردنال ہوں تو ان کا عرصہ تک خاموش رہنا ناممکن ہے۔اس لئے کہ کردنال رومہ کے اندر اور رومہ کے باہر جتھے بناتے ہیں اور جاگیردار ان کی تائید پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح رؤسائے کلیسا کی جاہ طلبی سے جاگیرداروں میں فسادات اور ہنگامے پیدا ہوتے ہیں۔ان اسباب کی بنا پر اب کہ تقدس ماب لیو[1] منصب پاپائی

---

(۱) لیودہم۔میدیچی خاندان سے تھا۔لورنزو مگنیفیسو کا بیٹا اور لورنزو کا چچا جس کے نام

پر سرفراز ہوئے ہیں کلیسا کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے اور ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جس طرح ان کے پیش روؤں نے اپنے زور بازو سے اس کی شان میں اضافہ کیا۔ اسی طرح تقدس ماب اپنی نیکی اور بے شمار اوصاف سے اور بھی عظمت اور وقار بخشیں گے۔

بادشاہ" معنون ہے۔ پوپ از ۱۵۱۳ء تا ۱۵۲۱ء

باب ۱۲

سپاہ کی اقسام اور زر آشنا سپاہ کا بیان

میں ایک ایک کر کے ان سب بادشاہتوں کی مختلف اقسام کا ذکر کر چکا ہوں جن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک حد تک ان کی قوت اور کمزوری کے اسباب سے بھی بحث کی ہے اور وہ طریقے بھی بتا دیئے ہیں جن سے لوگ بادشاہتیں حاصل کرتے ہیں اور حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ اب باقی رہا حملہ اور مدافعت کے ذرائع کا بیان۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بادشاہ کے لئے مملکت کی بنیادوں کا استوار کرنا کتنا ضروری ہے اس لئے کہ وہ اس کے بغیر تباہ نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ مملکتیں خواہ نئی ہوں خواہ پرانی یا مخلوط' ان کے لئے بنیادیں چیزیں ہیں۔ اچھے قوانین اور اچھی فوج مگر اچھے قانون بغیر اچھی فوج کے ممکن نہیں۔ البتہ اچھی فوج ہو تو اچھے قانون بھی ہوں گے فی الحال مجھے قوانین سے بحث نہیں صرف فوجوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ فوجیں جن سے بادشاہ اپنی مملکت کی مدافعت کرتا ہے کبھی خود اس کی ہوتی ہیں اور کبھی وہ مشتمل ہوتی ہیں زر آشناؤں' یا امدادی فوج یا دونوں پر زر آشنا اور امدادی فوج بیکار بھی ہوتی ہے اور خطرناک بھی۔ جو بادشاہ اپنی ریاست کی بنیاد ایسی فوج پر رکھے گا اسے کبھی پائیداری اور سلامتی نصیب نہ ہوگی۔ ان لوگوں میں آپس میں نفاق بھی ہوتا ہے انہیں ہوس تو بہت ہوتی ہے پر انضباط نہیں ہوتا۔ وفا ان میں نام کی نہیں ہوتی۔ دوستوں کے سامنے بڑے مردانگی کے دعوے کرتے ہیں۔ لیکن

جہاں دشمن سامنے آیا اور یہ ہیں کہ یہ جاوہ جا' نہ خدا کا خوف ہوتا ہے نہ انسان کا پاس۔ حملہ ہوتے ہی ٹکا سا جواب دے دیتے ہیں۔ غرض امن کے دنوں میں تمہیں یہ لوٹتے ہیں اور جنگ کے زمانے میں دشمن۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو بادشاہ سے دلی تعلق نہیں ہوتا کہ اس کے لئے اپنی جانیں کھپا دیں۔ دو چار ٹکوں کی خاطر بھلا کوئی اپنی جان قربان کیا کرتا ہے۔ جب جنگ نہیں ہوتی تو وہ شوق سے فوج میں بھرتی ہوتے ہیں مگر جب لڑنے کا وقت آتا ہے تو ایسے دم دبا کر بھاگتے ہیں کہ پھر کہیں انکا پتہ نشان نہیں ملتا۔ اس دعوے کا ثبوت ذرا بھی مشکل نہیں۔ اطالیہ کی بربادی کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اس نے اپنی تمام امیدیں ایک عرصہ تک زر آشنا فوجیوں سے وابستہ رکھیں اور گو پہلے پہل جب ایک دوسرے کا مقابلہ تھا تو انہوں نے کچھ اپنی بہادری دکھائی۔ جب غیر ملکوں سے مقابلہ ہوا تو ان کی ساری حقیقت کھل گئی۔ چنانچہ چارلس' شاہ فرانس نے اطالیہ پر قبضہ کیا ہے تو اس کے ہاتھ میں کھریا ایک ٹکڑا تھا[1] جس کسی نے[2] یہ کہا ہے کہ اس کا سبب خود ہمارے پاپ تھے بالکل سچ کہا ہے مگر پاپ وہ نہ تھے جو کہنے والے کے خیال میں آئے پاپ وہ تھے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور پاپی چونکہ بادشاہ تھے اس لئے سزا بھی انہیں بھگتنی پڑی۔

چاہتا ہوں کہ ان فوجوں کے ناکارہ پن کو ذرا اور واضح کر دوں۔ ان کرائے کی فوجوں کے سردار لائق ہوں گے یا نالائق۔ لائق ہیں تو ان پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا

---

(۱) اشارہ ہے الگزانڈر کے ایک لطیفہ کی طرف۔ اس نے چارلس ہشتم کے ہاتھوں اطالیہ کی فتح کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس فرانسیسی بادشاہ کو تلواروں کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لئے کہ اس کا کسی سے مقابلہ ہی نہیں کیا۔ فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں تو کھریا کے ٹکڑے تھے جن سے انہوں نے سپاہیوں کو ٹھہرانے کے لئے مختلف گھروں پر نشان کر لئے۔

(۲) غالباً "ساوونارولا کے الفاظ ہیں۔

ہے؟انہیں تو اپنی عظمت و مرتبہ بلند کرنے کی فکر لگی رہتی ہے یا اپنے آقا کو دبا کر یا آقا کی مرضی کے خلاف دوسروں پر ظلم کر کے اور اگر سردار لائق نہیں تو پھر یہ نالائق بادشاہ کی تباہی کا سبب بن جائے گی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہاتھوں میں ہتھیار ہوں تو سب ایک ہی طرح لڑتے ہیں روپے کی خاطر لڑنے والے ہوں تب اور نہ ہوں تب۔ تو میں یہ جواب دوں گا کہ جب بھی کسی بادشاہ یا جمہوریت کو جنگ کی ضرورت پیش آئے تو بادشاہ کو چاہیے کہ خود میدان میں اترے اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے اور جمہوریت ہو تو اپنے شہریوں میں سے کسی کو بھیجے۔ اگر وہ قابل اطمینان ثابت نہ ہو تو اسے واپس بلا لیا جائے۔ اور اگر لائق نکلے تو اسے اس خدمت کو انجام دینے پر قانون کے ذریعہ مجبور کیا جائے۔ تجربہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو بادشاہ اور جمہوریتیں اپنے بل بوتے پر کھڑی ہوئیں انہیں بڑی بڑی کامیابیاں ہوئیں اور جنھوں نے زر آشناؤں کو نوکر رکھا انہیں ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بدیسی سپاہیوں کی فوج کی بجائے اگر جمہوریت کی اپنی فوجیں ہوں تو اس پر کسی ایک شہری کا قبضہ زیادہ مشکل ہو گا۔ رومہ اور اسپارٹا مدتوں مسلح اور آزاد رہے۔ سوستان کے باشندے آج بھی کامل طور پر مسلح اور آزاد ہیں۔

زمانہ قدیم میں زر آشناؤں کی مثال کارتھیجوں میں ملتی ہے۔ رومے پہلی جنگ کے بعد ان زر آشنا سپاہیوں نے کیا کچھ مظالم نہ توڑے۔ حالانکہ فوجوں کے سردار خود کارتھیج کے شہری تھے۔ ایپامینودس کی موت کے بعد اہل ثیبہ نے فلپ مقدونی کو اپنے سپاہیوں کا سردار بنایا۔ فتح کے بعد اسی نے ان کی آزادی چھین لی۔

اسی طرح جب ڈیوک فلپو (1) کا انتقال ہو گیا اور میلانیوں نے اہل

---

(۱) موت ۱۳ اگست ۱۴۴۷ء کو واقع ہوئی

وینس کے خلاف فرانسسکو اسفورزا کو نوکر رکھا اور اس نے ان کو کاراواژ [1] پر شکست دینے کے بعد اپنے آقاؤں یعنی میلانیوں کو پیس ڈالنے کی خاطر انہیں سے اتحاد کر لیا۔ اس کا باپ اسفورزا نیپلس کی ملکہ ژیوونا کا ملازم تھا مگر جب وقت آیا تو اس نے اپنی ملکہ کو اپنے حال پر چھوڑا [2] اور وہ اپنی سلطنت بچانے کی خاطر اس بات پر مجبور ہوئی کہ ارگان کے بادشاہ کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کرے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ گذشتہ زمانے میں اہل وینس اور اہل فلورنس نے انہیں فوجوں کی مدد سے اپنے رقبوں کو وسعت دی اور فوجی سردار خود بادشاہ نہیں بنے۔ بلکہ ہمیشہ بادساہوں کی مدافعت کرتے رہے تو میرا جواب یہ ہو گا کہ اس معاملہ میں اہل فلورنس خاص طور پر خوش قسمت تھے۔ اس لئے کہ تمام لائق سردار جن کی طرف سے انہیں خوف ہونا چاہیے تھا ان میں سے بعض کو فتح نصیب نہ ہوئی۔ بعض کو مخالفین سے مقابلہ کرنا پڑا اور بعض نے کسی دوسری طرف توجہ کی۔ جن سرداروں کو فتح نصیب نہ ہوئی ان میں ژیووانی اکوتو [3] تھا۔ اسے کامیابی ہی نہیں ہوئی کہ اس کی وفاداری کا امتحان ہوتا مگر یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اگر اسے کامیابی ہوتی تو اہل فلورنس بالکل اس کے قبضہ قدرت میں ہوتے۔ براچیشی ہمیشہ اسفورزا کے خلاف رہے۔ اس وجہ سے وہ ایک دوسرے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ [4]

---

(۱) ۱۵ ستمبر ۱۴۴۸ء کا واقعہ ہے۔

(۲) ۱۴۲۶ء میں یہ صورت پیش آئی ملکہ ژیوونا دوم ۱۴۱۴ء تا ۱۴۳۵ء الفانسو شاہ نے آرگان کو متبنّیٰ بنایا اور وہی اس کا جانشین ہوا

(۳) جان ہاکوڈ نام کا ایک انگریز تھا ۱۳۶۱ء سے لے کر ۱۳۹۳ء تک جو اس کا سال وفات ہے اس زر آشنا سپاہ سالار کی حیثیت سے اطالیہ کی بہت سی جنگوں میں شرکت کی۔

(۴) ان دونوں خاندانوں میں مدتوں تک یہ چشمک جاری رہی۔

فرانسسکو کی توجہ لومبارڈی کی طرف رہی اور پراچیو کی کلیسا اور نیپلس کی طرف اب ذرا اور قریب آیئے' اہل فلورنس نے اپنی فوج کا سردار پاولو ویتلی کو بنایا۔ آدمی بہت دانا تھا معمولی حیثیت سے ترقی کر کے اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ وہ پیسا کو فتح کر لیتا تو اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اہل فلورنس پوری طرح اس کے قابو میں آجاتے اس لئے کہ اگر وہ اس کے دشمنوں سے ساز باز کرتے تو تباہ ہوتے اور اگر اس کا ساتھ دیتے تو اس کی کامل اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا۔

اگر اہل وینس کی قوت کے فروغ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے اپنے معاملات کو اس وقت تک ناموری اور سلامتی سے سرانجام دیا جب تک کہ ان کے تمام رعایا بلا فرق اعلیٰ و ادنیٰ کے ان جنگوں میں شرکت کرتی رہی۔ یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ انہوں نے اپنا رخ خشکی کی طرف نہیں کیا لیکن جب انہوں نے خشکی پر جنگیں شروع کیں تو انہوں نے ان طریقوں کو خیرباد کہا جن میں وہ ماہر تھے اور محض اطالیہ کے طریقوں پر چلنے پر اکتفا کیا۔

شروع شروع میں جب کہ براعظم پر ان کے مقبوضات میں اضافہ ہوا تو اس وجہ سے کہ ان کے پاس علاقہ محدود تھا اور ان کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ انہیں اپنے سپہ سالاروں کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ [۱] نہ تھا مگر جب ان کے علاقے وسیع ہوئے جیسا کہ کارمانولا کے راج میں واقع ہوا [۲] تو انہیں اپنی غلطی کا پتہ چلا پہلے تو اس نے بہت بہادری اور لیاقت کا ثبوت دیا۔ اس کی سرکردگی میں اہل وینس نے میلان کے ڈیوک کو شکست دی [۳] مگر اس کے بعد اس نے جنگ میں سستی برتی۔

---

(۱) اشارہ ہے تریویزو کی فتح کی طرف ۱۳۳۹ء

(۲) یہ صورت پیدا ہوئی۔ برگامو اور بریسچیا کی فتح یعنی ۱۴۲۸ء کے بعد۔

(۳) جنگ ۱۱ اکتوبر ۱۴۲۷ء کو کلیوڈیو کے قریب لڑی تھی۔

اس پر اہل وینس کو یہ قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ اب اس کے ذریعہ فتوحات ممکن نہیں۔ ممکن کیسے ہوں جب وہ خود ہی فتح کرنا نہ چاہے اسے برخاست کرنا یوں ممکن نہ تھا کہ جو کچھ فتح ہو چکا تھا اس کے بھی ہاتھ سے نکلنے کا خوف تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی بس یہی ایک صورت تھی کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ [۱] اس کی موت کے بعد اہل وینس کے کئی سپہ سالار ہوئے۔ برگامو کا بارتولویو [۲] سین سیویرینو کاروبرتو [۳] کاؤنٹ آف سپتیلیانو [۴] وغیرہم۔ ان سپہ سالاروں کے ماتحت فتوحات کا ڈر نہیں تھا۔ خطرہ تھا شکستوں کا۔ مثال کے طور پر وانلا کی شکست کو لیجئے کہ جہاں ایک معرکہ میں وہ سب کچھ کھو بیٹھے جو آٹھ صدیوں کی کوششوں سے حاصل ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ زر آشنا سپاہیوں کی مدد سے نفع آہستہ آہستہ اور دیر سے پہنچتا ہے۔ اور نفع ہوتا بھی تھوڑا ہے۔ مگر نقصان ناگہانی ہوتا ہے اور انسان ہکابکا رہ جاتا ہے۔

جو جو مثالیں میں نے ابھی دی ہیں وہ چونکہ اطالیہ سے متعلق ہیں اور اطالیہ پر بہت عرصہ سے زر آشنا سپاہ کی حکومت رہی ہے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ اس مسئلے کی تہہ تک پہنچوں۔ ان سپاہ کی ابتداء اور نشوونما کا پتہ چل جائے گا تو پھر آسانی سے ان کی اصلاح بھی ہو سکے گی۔ بس یوں سمجھئے کہ اس پچھلے دور میں شہنشاہی اختیار کو اطالیہ نے رد کرنا شروع کیا اور پوپ کی دنیاوی طاقت کا زیادہ لحاظ ہونے لگا تو اطالیہ یکایک بہت ساری مملکتوں میں تقسیم ہو گیا' کتنے ہی بڑے شہروں نے اپنے امراء کے خلاف علم بغاوت بند کیا' ان امراء کے خلاف جنہوں نے شہنشاہ کے بل بوتے پر اپنا تابع

---

(۱) ۵ مئی ۱۴۳۲ء کو اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔
(۲) فرانسسکو اسفورزا نے ۱۴۴۸ء میں اسے شکست دی۔
(۳) فرارا کے خلاف جو جنگ ۱۴۸۲ء میں ہوئی اس میں یہی سپہ سالار تھا۔
(۴) ۱۵۰۹ء میں وائیلا کے نزدیک کمبرکی لیگ کی افواج کو شکست فاش دی۔

بنا رکھا تھا۔ کلیسا نے ان کی مدد یوں کی کہ اس سے خود کلیسا کی دنیاوی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا۔ بہت سے دوسرے شہروں میں شہری بادشاہ بن بیٹھے اس طرح جب اطالیہ پوری طرح کلیسا اور بعض جمہوریتوں کے زیر نگیں آگیا تو اس وجہ سے کہ کلیسا مشتمل تھا پادریوں پر اور جمہوریتیں مشتمل تھیں ایسے شہریوں پر جنہیں ہتھیاروں سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ غیر ملکیوں کو ملازم رکھنا شروع کیا۔ پہلا شخص جس نے ان فوجیوں کا رتبہ بڑھایا وہ روماناکے شہر کونیو کا باشندہ البریڈ تھا [1] اسی کے تیار کردہ لوگوں میں پراچیو اور اسفورزا تھے جو اپنے زمانے میں اطالیہ کی قسمت کے مالک تھے۔ ان کے بعد اب تک اسی قبیل سے کتنے ہی لوگ ہوئے جو زر آشنا سپاہ کے سردار ہوئے۔ یہ انہیں کے کرتوت ہیں کہ ہمارے ملک پر چارلس [2] نے دھاوا بولا۔ لوئیز [3] نے اسے لوٹا کھسوٹا اور فرڈیننڈ [4] نے تباہ و برباد کیا اور اہل سوستان کے ہاتھوں اس کی توہین ہوئی۔

ان زر آشنا سپاہ کا پہلا مقصد یہ تھا کہ پیادہ فوج کو بدنام کریں تاکہ خود ان کی اہمیت دوبالا ہو چنانچہ ان کو دل کھول کر بدنام کیا ان کے پاس اپنی کوئی جائیداد یں تو تھیں نہیں ان کا گزارہ اسلحہ کے استعمال پر تھا۔ اب تھوڑی سی پیادہ فوج ان کے ماتحت رہتی تو ان کی عزت کیا خاک ہوتی۔ اور تعداد زیادہ ہوتی تو ان کا پیٹ کون بھوتا؟ یہی وجود تھے کہ انہوں نے سوار فوج کو پیادہ فوج پر ترجیح دی۔ سوار فوج مختصر بھی ہو تو اس سے عزت و افتخار ممکن ہے اور اس کی پرداخت زیادہ آسان ہے۔ آخرش حالت

---

(۱) چودہویں صدی کے آخیر کا آدمی ہے۔ پہلا شخص ہے جس نے کمپانیا دی سان ژیور ژیو نام کی اطالوی فوجیں تیار کیں۔

(۲) مراد ہے چارلس ہشتم شاہ فرانس ۱۴۸۳ء تا ۱۴۹۸ء

(۳) لوئز دوازدہم شاہ فرانس ۱۴۹۸ء تا ۱۵۱۵ء

(۴) فرڈیننڈ شاہ ہسپانیہ ۱۴۷۹ء تا ۱۵۱۶ء فاتح نیپلس

بایں جارسید کہ فوج کی تعداد بیس ہزار تھی اور اس میں دو ہزار بھی پیادہ سپاہی نہ تھے اس کے علاوہ وہ بھی اپنے آپ کو اور اپنی فوج کو تکان اور خطرہ سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ جنگ میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے تھے' قید کر لیا کرتے تھے جو بعد میں بغیر فدیہ کے رہا کر دیئے جاتے تھے۔ کسی شہر پر بھی رات کے وقت حملہ نہ کرتے تھے اور خود شہر کے اندر ہوتے تو رات کو جو محاصرہ کئے ہوئے ہو اس پر دھاوا نہ بولتے تھے ان کے پڑاؤں کے چاروں طرف نہ فصیلیں ہوتی تھیں نہ خندقیں۔ سردی کے موسم میں جنگ سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ ان کے فوجی قوانین سے ان سب باتوں کی تائید ہوتی تھی اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ سب اس وجہ سے کہ تکان اور خطرہ ان کے پاس بھٹک کر نہ آئے۔ اسی کا نتیجہ اطالیہ کو غلامی اور ذلت کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

✪ ☐ ✪

باب ۱۳

امدادی، مخلوط اور قومی سپاہ

بیکار سپاہ کی دوسری قسم امدادی سپاہ ہے۔ ان سے میری مراد وہ فوجیں ہیں جو کوئی بادشاہ جس سے امداد طلب کی جائے مدد اور مدافعت کے لئے لے کر آئے۔ مثلاً" زمانہ قریب میں جب پوپ جولیس دوم نے دیکھا کہ اس کے زر آشنا سپاہی فرارا کی مہم میں نکمے ثابت ہوئے تو اس نے امدادی فوجوں سے کام نکالنا چاہا۔ اور فرڈی نینڈ شاہ اسپین سے سوار اور پیادہ سپاہیوں کے حاصل کرنے کا انتظام کر لیا۔ (۱)

ممکن ہے کہ امدادی سپاہ بہترین سپاہ ہو اور بذات خود کار آمد بھی ہوں مگر جو کوئی انہیں مدد کے لئے بلاتا ہے وہ عموماً" نقصان میں ہی رہتا ہے اس لئے کہ اگر انہیں شکست ہوتی ہے تب وہ مارا جاتا ہے اور اگر فتح ہوتی ہے تو ان کا قیدی ہو جاتا ہے قدیم تاریخیں اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں مگر پوپ جولیس کی یاد ابھی لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ میں اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ اس کی انتہائی نادانی تھی کہ فرارا کو حاصل کرنے کی خاطر جس کے لئے وہ بے چین تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک غیر ملکی کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ بچ نکلا۔ اور اس کو اپنے غلط اعتماد کا نتیجہ بھگتنا پڑا اس لئے کہ جب رونیا (۲) پر اس کی امدادی سپاہ کو شکست ہوی

---

(۱) اشارہ ہے اس "مقدس لیگ" کی طرف جو ۱۵۱۱ء میں لوئز دوازدہم شاہ فرانس کے خلاف قائم ہوئی۔

(۲) یہ شکست ۱۱ اپریل ۱۵۱۲ء کو فرانسیسیوں کے ہاتھوں ہوئی جن کا سپہ سالار گاستوں دے فوا تھا' اور جو اس لڑائی میں کام آیا۔

تو اہل سوستان نے یکایک ہلا[1] بول دیا۔ اور خود اپنی اور دوسروں کی توقع کے بالکل خلاف فاتحوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی بنا۔ قیدی کیسے بنتا جبکہ دشمن خود ہی ففرو ہوگئے۔ اور نہ اپنے مددگاروں کا قیدی بنا۔ اس لئے کہ فتح ان کے زور بازو کا نہیں' دوسروں کے زور بازو کا نتیجہ تھی۔ جب اہل فلورنس کے پاس اپنی کوئی فوج نہ رہی تو وہ دس ہزار فرانسیسی سپاہی پیسا[2] کے محاصرہ کے لئے لائے اور اس طرح اپنے آپ کو ایسے بڑے خطرے میں ڈالا جیسا پہلے کسی موقع پر نہ ڈالا تھا اسی طرح اپنے آپ کو ہمسایوں سے بچانے کے لئے شہنشاہ قسطنطنیہ نے دس ہزار ترک سپاہیوں کو یونان میں بلایا۔[3] لڑائی ختم ہوگئی مگر وہ نہ گئے اس طرح ان بے عنوانیوں کے ماتحت یونان کی غلامی کی ابتداء ہوئی پس جو کوئی فتح سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہے وہ امدادی فوج سے کام لے۔ امدادی فوج زر آشنا سپاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ تباہی اس کے ساتھ چلتی ہے وہ خود متحد ہوتے ہیں اور اپنے افسروں کے حکم پر چلتے ہیں۔ اور زر آشنا اگر فتح پانے کے بعد نقصان پہچانا بھی چاہیں تو اس کے لئے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اور بہتر موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ وہ خود مختلف کمپنیوں میں منقسم ہوتے ہیں جنہیں بادشاہ بھرتی کرتا ہے اور جن کو اپنے پاس سے تنخواہیں دیتا ہے۔ ان کے افسر اعلیٰ کے لئے جسے بادشاہ خود مقرر کرتا ہے یہ ممکن نہیں کہ ان میں ایسا اثر پیدا کرلے جو اس کے لئے خطرہ کا

---

(۱) اس موقع پر بیس ہزار سوستانی امدادی سپاہ نے شرکت کی ان کی مداخلت سے صورت حال نے ایسا پلٹا کھایا کہ فرانسیسیوں کو اطالیہ چھوڑتے ہی بنی۔

(۲) ایک کامیاب حملہ کے بعد ان فوجوں نے بغاوت کی اور اخیر میں میدان چھوڑ کر بھاگیں۔

(۳) ۱۳۴۶ء میں اپنی مدافعت کے لئے شہنشاہ نے ترکوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور سلطان سلیمان کے زمانہ میں دس ہزار یورپ ترک میں داخل ہوئے ۱۳۵۵ء میں شہنشاہ اس دنیا سے سدھار گیا مگر ترک وہاں سے نہ ٹلے۔

باعث ہو۔ مختصر یہ ہے کہ زر آشنا سپاہ سے خطرہ ہوتا ہے ان کی بزدلی کی وجہ سے اور امدادی سپاہ سے ڈر ہوتا ہے ان کی بہادری کی سبب۔ اس لئے ذی عقل بادشاہ ہمیشہ ان سپاہ سے گریز کرتے ہیں اور خود اپنی فوج پر بھروسہ کرتے ہیں اور پھر اگر شکست بھی ہو تو اسے اس فتح پر ترجیح حاصل ہے جو غیروں کی مدد سے حاصل ہو وہ اس فتح کو جو دوسروں کی مدد سے حاصل کی جائے سچی فتح نہیں سمجھتے۔

سیزرے بورژیا اور اس کے کاموں کی مثال دینے سے میں کبھی نہیں چوکوں گا۔[1] رومانہ میں وہ امدادی فوج لے کر داخل ہوا۔ امدادی سب کے سب فرانسیسی سپاہی تھے۔ ان کی مدد سے اس نے امولا اور فورلی کو فتح کیا مگر بعد میں جب اس نے دیکھا کہ ان فوجوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تو ان کی جگہ اس نے زر آشنا سپاہی رکھے کہ ان سے اس کے خیال کے بموجب کم خطرہ تھا اس نے آرسینی اور ویتیلی کو نوکر رکھا۔ جب انہیں بھی اس نے ناقابل اعتبار' دغا باز اور خطرناک پایا تو ان سے بھی نجات حاصل کی اور ان فوجوں پر بھروسہ کیا جو اس نے خود بھرتی کی تھیں۔ ان مختلف اقسام کے سپاہیوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ اگر ہم ڈیوک کی شہرت پر نظر ڈالیں جو اسے اس وقت حاصل تھی جب وہ فرانسیسی سپاہ کا سہارا لئے ہوئے تھا۔ اور اس کا مقابلہ اس شہرت سے کریں جو اسے آرسینی اور ویتیلی کو ملازم رکھنے کے بعد حاصل ہوئی اور پھر اس شہرت سے جو اسے اس وقت حاصل ہوئی جب اس کا دارومدار اپنی فوجوں اور اپنے وسائل پر ہوا۔ اس طرح جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کی شہرت بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے سب سے زیادہ ناموری اسی وقت حاصل کی جب ہر ایک کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنی فوج کا تن تنہا مالک ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہوں ساتواں باب

میری خواہش تھی کہ بس اطالیہ کی جدید تاریخ سے مثالیں اخذ کروں۔ مگر میں ہیرو سائرا کیوزی [1] کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں جب اسے اہل سائرا کیوز نے اپنا سپہ سالار بنایا تو اس نے فوراً" ہی اندازہ کر لیا کہ زر آشنا سپاہ سے کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ ان کے سردار ایسے ہی تھے جیسے اطالوی "کون دوتیری" وقت یہ تھی کہ نہ تو انہیں رکھا ہی جا سکتا تھا اور نہ انہیں علیحدہ کرنا ہی ممکن تھا۔ چنانچہ اس نے سب تہ تیغ کر ڈالا اور بعد میں جو جنگیں کیں ان میں ملکی سپاہیوں سے کام لیا اور دوسروں سے کسی قسم کی مدد نہیں لی۔

توراۃ میں اس مضمون کا ایک بہت خوب ٹکڑا ہے جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں جب حضرت داؤد نے اپنی خدمات جالوت فلسطینی کے خلاف جنگ کرنے کے لئے کوسال کو پیش کیں تو سال نے ان کی ہمت بڑھانے کے لئے ان کو خود اپنے زرہ بکتر سے مسلح کیا مگر اسلحہ پہنتے وقت انہوں نے فرمایا کہ معاف کیجئے ایسے ناآموزدہ ہتھیاروں سے غالب آنا میرے بس کی بات نہیں دشمن کے ساتھ لڑتا ہو تو اپنی گوفان اور تلوار ہی کو ترجیح دیتا ہوں بات یہ ہے کہ دوسروں کے ہتھیار یا تو اپنے لئے بہت بڑے ہوں گے یا بہت تنگ، کبھی وہ گریں گے۔ کبھی وہ رکاوٹ پیدا کریں گے اور کبھی اپنے بوجھ سے دبالیں گے۔ لوئیز نہم کے والد چارلس [2] ہفتم جس نے اپنی خوش نصیبی اور شجاعت کی مدد سے فرانس سے انگریزوں کو نکالا۔ اسے بھی اس ضرورت کا احساس تھا کہ قومی فوج کی ذریعہ اپنی طاقت بڑھائے۔ اس نے ایسے قوانین مرتب کئے جن میں سوار اور پیدل فوج دونوں کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے گئے تھے مگر بعد میں اس کے بیٹے شاہ

---

(۱) ساتویں باب میں ذکر آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو متعلقہ حاشیہ

(۲) چارلس ہفتم شاہ فرانس ۱۴۲۲ء تا ۱۴۶۱ء میں اس نے ایک رسالہ کی بنیاد ڈالی جو شرفا پر مشتمل تھا اور ۱۴۴۸ء میں پیادہ فوج تیار کی۔

لوئیز نے پیادہ فوج کو برطرف کر دیا اور سوستانی زر آشنا سپاہیوں کو نوکر رکھنا شروع کر دیا۔ (۱) یہی غلطی بعد کے بادشاہوں نے بھی کی اور جیسا کہ نتائج سے ظاہر ہے۔ (۲) یہی وجہ تھی کہ ان خطرات کی جن سے فرانس کو دوچار ہونا پڑا سوستانی فوجوں کی شہرت بڑھنے سے فرانس کی تمام قومی سپاہ کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ فرانسیسی پیادہ فوج کے ختم ہونے سے فرانس کی سوار فوج غیرملکیوں کی دست نگر ہوگئی۔ سوستانی سپاہیوں سے اس کا ساتھ اتنا رہا کہ وہ یہ سمجھنے لگی کہ وہ سوستانیوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اب حالت یہ ہے کہ فرانسیسی کسی طرح سوستانیوں کے ہم پلہ نہیں۔ اور ان کے بغیر دوسروں پر ہرگز غالب نہیں آسکتے۔

مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ فرانس کی فوج مخلوط ہے اس کا ایک حصہ قومی سپاہ پر مشتمل ہے اور ایک حصہ زر آشنا سپاہ پر۔ اس قسم کی فوجیں ان فوجوں سے تو بہت بہتر ہوتی ہیں جو محض زر آشنا یا امدادی سپاہ پر مشتمل ہوں۔ مگر خالص قومی سپاہ کے مقابلہ میں نہایت گھٹیا ہوتی ہیں۔ خود فرانس کی مثال فیصلہ کن ہے چارلس ہفتم کے فوجی قوانین برقرار رکھے گئے ہوتے اور انہیں اور وسعت دی گئی ہوتی تو کوئی بھی ملک فرانس کا بال بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دور اندیشی کی کمی کے سبب لوگ بعض اوقات ایسی تبدیلیاں عمل میں لاتے ہیں جو بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہیں اور شروع شروع میں جن کی چھپی ہوئی خامیوں کا پتہ نہیں چلتا وہی تپ دق کا سا معاملہ ہوتا ہے جس کا ذکر میں کر چکا ہوں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ جو حاکم پہلے سے آنے والی خرابیوں کا اندازہ نہ لگا سکے اسے بہت خردمند نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ وصف بہت کم لوگوں کو ودیعت ہوا کرتا ہے۔

---

(۱) معاہدہ مورخہ ۲ جنوری ۱۴۷۳ء کی رو سے اس کو سوستانی سپاہ بھرتی کرنے کا حق حاصل ہوا۔
(۲) کتاب "بادشاہ" اطالیہ سے فرانسیسیوں کے اخراج کے ایک سال بعد تصنیف ہوئی ہے۔

سلطنت رومہ کے زوال کے اسباب کو تلاش کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ زوال کی ابتداء زر آشنا گاتھک سپاہ کو نوکر رکھنے سے ہوئی۔ ادھرانہیں نوکر رکھا اور ادھر اہل رومہ کی قوت گھٹنا شروع ہوئی۔ اور ان میں جو جو خوبیاں تھیں وہ گاتھوں میں منتقل ہو گئیں۔ مختصر یہ ہے کہ بغیر قومی سپاہ کے کوئی بھی بادشاہت محفوظ نہیں ایسی بادشاہت کا دارومدار بس قسمت پر ہو گا اس لئے کہ اس کے پاس وہ طاقت تو ہوگی نہیں جس سے مصیبت کے وقت وہ اپنی مدافعت کر سکے اور عقل مند لوگوں کی ہمیشہ سے یہ قطعی رائے رہی ہے کہ طاقت و جبروت کی اس شہرت سے زیادہ غیر مستحکم اور عارضی کوئی شے نہیں جس کی بنیاد خود اپنے زور بازو پر نہ ہو۔ قومی فوج سے میری مراد ایسی فوج ہے جو مشتمل ہو اپنی رعایا' شہریوں اور محکموں پر ان کے علاوہ اور سپاہ یا زر آشنا ہوگی یا امدادی۔

جن طریقوں سے فوجیں بنا کرتی ہیں ان کا معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں۔ اگر ان اصولوں پر اچھی طرح عمل کیا جائے جن پر متذکرہ بالا چار حاکم عمل پیرا ہوئے۔ اور اس پر بھی غور کیا جائے کہ سکندر اعظم کے والد فلپ اور بہت سے دوسرے بادشاہوں اور جمہوریتوں نے کیونکر فوجیں تیار کیں۔ میرے لئے یہاں پر صرف ان مثالوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔

باب ۱۴

بادشاہ کے جنگی فرائض

بادشاہ کی توجہ کا مرکز صرف ایک ہونا چاہیے اور اس کے دماغ میں بس ایک خیال کے لئے جگہ ہونی چاہیے یعنی جنگ کے لئے۔ اسے مہارت بھی جنگ اور اس کے تمام متعلقات میں پیدا کرنی چاہیے کہ یہی وہ فن ہے جو حاکموں کے لئے موزوں ہے پھر یہ مفید بھی اس قدر ہے کہ اس کی بدولت نہ صرف خاندانی بادشاہ اپنی حکومت قائم رکھ سکتے ہیں بلکہ معمولی افراد بھی اس کی مدد سے بادشاہت کے اعلیٰ رتبہ تک پہنچ سکتے ہیں برخلاف اس کے جب بادشاہ جنگ سے توجہ ہٹالیتے ہیں اور لہو ولعب میں پڑ جاتے ہیں تو وہ اپنے مقبوضات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جس طرح اس فن سے بے توجہی تباہی کا سبب ہوتی ہے اسی طرح اس فن میں مہارت پیدا کرنے سے یقینی طور پر طاقت حاصل کی جاسکتی ہے یہ فن جنگ میں مہارت ہی تھی جس نے فرانسسکو اسفورزا کو معمولی حیثیت سے بڑھا کر میلان کا ڈیوک بنادیا۔ پھر جب اس کی اولاد کو جنگ کی ہاہمی نہیں بھائی تو بادشاہت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ [1] اس لئے کہ غیر مسلح ہونے کی وجہ سے جہاں اور مصیبتیں آئی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جس سے بچنا بادشاہ کے لئے خاص طور پر ضروری ہے میں ابھی اس کو اور تفصیل سے بیان کروں گا۔

---

(۱) اس کے بیٹے لودودیچو ال مورو سے لوئیز دوازدہم نے میلان چھین لیا اس کی موت ۱۵۱۰ء میں فرانسیسی قید خانہ میں واقع ہوئی۔

مسلح اور غیر مسلح آدمی کا مقابلہ کیا؟ اور جب یہ صحیح ہے تو یہ بات تو خلاف عقل ہے کہ ایک شخص مسلح ایک غیر مسلح شخص کی اپنی رضامندی سے اطاعت کرے یا ایسا غیر مسلح شخص جس کے چاروں طرف مسلح ملازمین ہوں محفوظ رہے۔ جب ایک طرف حقارت ہو اور دوسری طرف بے اعتمادی تو صحیح تعاون کیونکر ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بادشاہ فن جنگ سے بے بہرہ ہو گا اسے اور وقتوں کے علاوہ کبھی بھی اس کے سپاہی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے اور نہ وہ ان پر اعتماد کر سکے گا پس بادشاہ کو کبھی مسائل سے توجہ نہیں ہٹانی چاہیے زمانہ جنگ ہی میں نہیں امن و امان کے دوران میں اور بھی زیادہ دلچسپی لینا چاہیے۔ یہ ممکن ہے دو طرح سے' ایک عملی طور پر' دوسرے مطالعہ کے ذریعہ۔

جہاں تک عمل کا تعلق ہے اسے چاہیے کہ اپنی فوج کو صف آرائی کی اعلیٰ تعلیم دے۔ قواعد کی پابندی کرائے۔ علاوہ ازیں اسے برابر شکار کھیلتے رہنا چاہیے۔ یہ اس لئے کہ اس کا جسم سختیوں اور تکان کا عادی ہو۔ اسی کے ساتھ اس مقامات کا علم حاصل ہو۔ وہ پہاڑوں کے ڈھال' وادیوں کی کشادگی' میدانوں کی وسعتیں دیکھے دریاؤں اور دلدلوں سے واقفیت حاصل کرے اور اس مضمون پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرے۔ یہ معلومات دو طرح پر اس کے کام آئیں گی۔ اولاً" اسے اپنے ملک کی واقفیت حاصل ہوگی اور اس کی مدافعت کے طریقوں کی بہتر سمجھ پیدا ہوگی اور دوسرے اپنے ملک کے مختلف مقامات کی واقفیت سے یہ بھی فائدہ ہو گا کہ جن علاقوں کو وہ پہلے سے نہیں جانتا انہیں بھی ذرا سی دیر میں سمجھ سکے گا۔ مثال کے طور پر صوبہ تسکنی کی پہاڑیاں' وادیاں' میدان' دریا اور دلدل ویسے ہی ہیں جیسے کہیں اور کے۔ تو اس صوبہ کے جغرافیہ طبعی کی معلومات سے اسی قسم کے دوسرے صوبوں کے متعلق معلومات بغیر کسی دقت کے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جس بادشاہ کو اس قسم کی معلومات

حاصل نہ ہوں وہ اچھا سپہ سالار نہیں بن سکتا۔ کہ انہیں معلومات سے اسے پتہ چلتا ہے کہ دشمن کو کیونکر اچانک آگھیرے۔ لشکر کے پڑاؤ کے لئے جگہ کا کس طرح انتخاب کرے۔ اپنی فوج کے کوچ کی سمت کیسے مقرر کرے۔ اپنی فوج کو جنگ کے لئے کیونکر ترتیب دے اور محاصرہ کس طرح کامیابی کے ساتھ کرے۔

اکائیوں کے بادشاہ فلو پومن [1] کی جہاں مورخوں نے اور تعریفیں کی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ امن و امان کے زمانہ میں جنگ کے طریقوں پر غور و خوض کرتا رہتا تھا۔ جب ملک کے کسی حصہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جاتا تو چلتے چلتے اکثر ٹھہر جاتا۔ اور اس موضوع پر ان سے تبادلہ خیالات کرتا۔ کبھی یوں کہتا کہ اگر دشمن اس پہاڑی پر ہو اور ہم اپنی قوم کے ساتھ یہاں ہوں تو کون فائدہ میں رہے گا؟ دشمن پر حملہ کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہو گا؟ اگر ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے تو کونسی راہ اختیار کرنی چاہیے؟ اور اگر دشمن پسپا ہو تو ہمیں اس کا کیونکر پیچھا کرنا چاہیے؟ اس طرح فوج کو جو صورتیں پیش آسکتی ہیں ان پر چلتے چلتے اپنے دوستوں سے سوال کرتا جاتا اور ان کی رایوں کو غور سے سنتا۔ اپنی رائے سے آگاہ کرتا اور اپنی رائے کے ساتھ دلیلیں پیش کرتا۔ اس مسلسل غور و فکر ہی کا نتیجہ تھا کہ میدان جنگ میں ایسی کوئی پیچیدگیاں نہ تھیں جن کا حل اس کے پاس موجود نہ ہو۔

رہی ذہنی تربیت سو اس کے لئے بادشاہ کو تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور ان کتابوں میں مشاہیر کے کارناموں کو خاص طور پر ذہن نشین کرنا چاہیے کہ وہ جنگوں میں کیا کرتے تھے۔ ان کی فتوحات اور شکستوں کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ جہاں انہیں کامیابی ہوئی وہاں ان کی پیروی کی جاسکے اور ان کی

---

(۱) ۲۵۳ تا ۱۸۳ ق۔م

غلطیوں سے احتراز۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمانہ گزشتہ کا اکثر اکابر کی طرح وہ نمونہ کے طور پر کسی ایسے شخص کو اپنے سامنے رکھے جو اس سے پہلے غیر معمولی شخصیت اور ناموری حاصل کر چکا ہو۔ اسے چاہیے کہ ایسے شخص کے کارنامے ہر وقت اپنے پیش نظر رکھے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کے سامنے نمونہ کے طور پر اچیلیز تھا سیزر کے پیش نظر اسکندر' سیپیو کے سامنے سائرس اور جو کوئی ایک دفعہ زینوفن کی لکھی ہوئی اس آخر الذکر شخصیت کی سوانح عمری کا مطالعہ کرے گا کہ اس کو بعد میں سیپیو کی زندگی میں پتہ چل جائے گا کہ اس کی کامرانی میں اس تقلید کا کتنا بڑا حصہ تھا اور جیسا کہ زینوفن نے بیان کیا ہے کہ وہ پاکدامنی' حسن اخلاق اور رحمدلی میں سائرس سے کتنا ملتا جلتا تھا۔

دانش مند بادشاہوں کو انہیں طریقوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ امن دامان کے دوران میں بھی اسے چین سے نہ بیٹھنا چاہیے بلکہ ایسے زمانہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ آڑے وقت میں یہ محنت کام آئے اور جب قسمت اس کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ اس کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔

✪ ❑ ✪

باب ۱۵

وہ خصائل جن کی بنا پر لوگوں اور خاص طور پر بادشاہوں کی تعریف یا مذمت ہوتی ہے

اب یہ غور کرنا باقی ہے کہ رعایا اور احباب کی طرف بادشاہ کا کیا رویہ اور انداز ہونا چاہیے مجھے پتہ ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میرا اس پر کچھ لکھنا ممکن ہے بے ادبی کی طرف محمول کیا جائے اور یہ خاص طور پر اس وجہ سے کہ میری رائے اس معاملہ میں دوسروں کی رائے سے بہت زیادہ مختلف ہے۔

مگر جب میرا یہ مقصد ٹھیرا کہ وہ باتیں لکھوں جو میری تصنیف کے سمجھنے والے کے لئے مفید ہوں تو پھر میں بجائے معاملات کی من گھڑت تصویر کے کیوں نہ ان کی سچی تصویر کھینچوں۔ اس لئے کہ بہت سی ایسی بادشاہتیں اور جمہوریتیں ہیں جو کبھی معرض وجود میں نہیں آئیں اور ان کی محض خیالی تصویریں کھینچی گئی ہیں ہماری زندگی کا انداز جیسا ہے اور جیسا ہونا چاہیے ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور جو کوئی اسے نہیں سمجھتا وہ نجات کی بجائے اپنی تباہی کی صورت پیدا کرتا ہے اس لئے کہ ایسی دنیا میں جہاں تمام انسان نیک نہیں۔ ہر معاملہ میں کامل نیکی کو اپنا معیار بنانا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے جس بادشاہ کا بادشاہت سے جی کھٹا نہ ہو گیا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ نیکی کے علاوہ اور بھی کچھ سیکھے اور نیکی کا استعمال موقع محل کے لحاظ سے کرے۔

اب اگر بادشاہ کے متعلق خیالی تصورات کو الگ کیا جائے اور صرف حقیقی

باتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو میں کہوں گا کہ جب لوگوں کا ذکر ہوتا ہے اور خاص طور پر بادشاہوں کا کہ وہ بہت بلند و برتر سمجھے جاتے ہیں تو ان کے وہ خصائل گنائے جاتے ہیں جن میں تعریف یا مذمت کا پہلو نکلے مثلاً" کسی کو کشادہ دست کہا جاتا ہے اور کسی کو کنجوس (لالچی کی جگہ میں لفظ کنجوس استعمال کر رہا ہوں اس لئے کہ میں اس خصلت کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں جس کی بنا پر کوئی شخص اپنی ذاتی دولت خرچ کرنے میں جزرسی برتے۔ لالچ سے مراد طبیعت کا وہ انداز ہے جس میں دوسروں کے مال پر انسان کی نظر ہو) ایک کو فیاض بتاتے ہیں' ایک کو لالچی۔ کوئی سنگ دل کہلاتا ہے کوئی نرم دل۔ ایک کو بدعہد کہتے ہیں ایک کو بات کا سچا۔ کوئی زنخا اور بزدل' کوئی جانباز اور دلاور' کوئی خوش اخلاق' کوئی مغرور' ایک آوارہ' دوسرا پاک دامن۔ ایک دیانتدار اور دوسرا فطرتی۔ کوئی مستقل مزاج کوئی متلون' کوئی سنجیدہ کوئی چھچھورا' کوئی دین دار' کوئی بے دین وغیرہ۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اگر بادشاہ میں وہ تمام متذکرہ بالا اوصاف ہوں جو اچھے شمار کئے جاتے ہیں تو بہت ہی قابل تعریف بات ہوگی مگر ان تمام خوبیوں کا اس میں جمع ہونا یا ان پر ہمیشہ عمل پیرا ہوا تو ناممکن ہے کہ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور جب یہ صورت ہے تو بادشاہ کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی بدنامی سے بچائے جس سے اس کے تخت چھن جانے کا ڈر ہو۔ یہی نہیں' ممکن ہو تو اس بدنامی سے بھی بچے جس سے اس قسم کا خطرہ نہ ہو اور اگر پوری طرح بچ نہ سکے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اس کی بدنامی ایسی برائیوں کی وجہ سے ہو جن کے بغیر حکومت قائم نہ رہ سکتی ہو تو اس کی اسے ذرا پرواہ نہیں کرنی چاہیے اس لئے کہ اگر وہ ان معاملات پر اچھی طرح غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ بعض اوقات ایسا طرز عمل جو بظاہر اسے اچھا معلوم ہوتا ہے اس کی تباہی کا موجب ہوتا ہے برخلاف اس کے ایسا طرز عمل جو ظاہر میں برا دکھائی دیتا ہے اس کی سلامتی اور خوش حالی کا سبب بنتا ہے۔

باب ۱۶

کشادہ دستی اور کنجوسی

پہلے کشادہ دستی کو لیجئے۔ کشادہ دست مشہور ہونا اچھا ہے مگر دقت یہ ہے کہ اگر کشادہ دستی برتنے پر بھی شہرت نہ حاصل ہوسکے تو اپنے آپ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچھے کاموں پر روپیہ صرف بھی کیا جاتا ہے تو لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا اور کنجوسی کے الزام سے بریت نہیں ہوتی۔ پس دنیا میں کشادہ دست مشہور ہونے کے لئے بڑی شان و شوکت سے رہنا پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بادشاہ کشادہ دست خیال کیا جاتا ہے اس کی تمام دولت اسی قسم کی چیزوں پر صرف ہوجاتی ہے اور آخیر میں اپنی اس شہرت کو قائم رکھنے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے کہ اپنی رعایا پر غیر معمولی محصول لگائے۔ جائیدادیں ضبط کرے اور روپیہ وصول کرنے میں اسی قسم کی اور ترکیبوں سے کام لے۔ مگر اس طرح رعایا اس سے نفرت کرنے لگتی ہے اور جب اس کے پاس دولت کی فراوانی نہیں رہتی تو لوگوں کی نظر میں اس کی عزت بھی خاک ہوجاتی ہے اس طرح جب اپنی کشادہ دستی سے بہت سوں کو ناراض اور تھوڑوں کو خوش کرپاتا ہے تو اپنے آپ کو اس سے کچھ بہتر نہیں پاتا جہاں پہلے تھا۔ اور جن خطرات کا اسے شروع میں سامنا تھا وہ ویسے کے ویسے باقی رہتے ہیں پھر جب اسے اس کا پتہ چلتا ہے اور وہ اس راہ پر پلٹنا چاہتا ہے تو اس پر کنجوسی کا الزام لگتا ہے۔

پس چونکہ بادشاہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر کشادہ دستی کے اصول پر اس طرح عمل کرے کہ دوسروں کو اس کا علم ہو اور اس کے

لئے عقلندی کی بات بھی ہے کہ اگر لوگ اسے کنجوس بھی کہیں تو اس کی کچھ پرواہ نہ کرے۔ اس لئے کہ ایسا وقت بھی آئے گا کہ جب لوگ اسے بہتر خیال کریں گے یہ اس وقت جب وہ دیکھیں گے کہ اپنی کفایت شعاری کی بدولت اس کے پاس روپے کی کمی نہیں اور وہ ہر حملہ آور کے مقابلہ میں اپنی مدافعت کر سکتا ہے اور اپنی رعایا پر بوجھ ڈالے بغیر بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتا ہے اور اس طرح وہ ان سب کے ساتھ کشادہ دلی برت سکتا ہے۔ جس سے وہ کچھ وصول نہیں کرتا اور جن کی تعداد بے شمار ہوتی ہے رہی اس کی کنجوسی' سو اس کا اثر صرف ان پر پڑتا ہے جنہیں وہ کچھ نہیں دیتا اور جن کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

ہمارے اپنے زمانے میں سوائے ان بادشاہوں کے جو کنجوس سمجھے جاتے تھے اور کسی نے بڑے بڑے کام سرانجام نہیں دیئے باقی جتنے تھے انہیں تباہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پوپ جولیس دوم نے پوپ بننے کے لئے تو ضرور اپنی کشادہ دستی کی شہرت سے کام لیا لیکن جب شاہ فرانس سے جنگ کی تو اس شہرت کو باقی رکھنے کی کوشش نہیں کی جتنی لڑائیاں لڑیں ان کے لئے اپنی رعایا پر ایک بھی نیا محصول نہیں لگایا اور زائد اخراجات کو اس روپے سے پورا کیا جو ایک مدت تک کفایت شعاری برتنے سے اس کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ اسی طرح اگر موجودہ شاہ ہسپانیہ کشادہ دست مشہور ہوتا تو اتنی مہموں میں نہ تو وہ شریک ہو سکتا اور نہ ان میں کامیابی حاصل کر سکتا۔

پس کنجوسی کا الزام لگتا ہے تو لگا کرے اگر بادشاہ اس کی بدولت رعایا کو لوٹنے سے بے نیاز ہو جائے' اپنی مدافعت کر سکے' افلاس اور حقارت سے اپنے آپ کو بچا سکے اور لوٹ کھسوٹ کی اسے ضرورت نہ رہے تو اسے اس الزام کی ذرا پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ یہ ایسی خرابی ہے جس سے حکومت کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اب اگر کوئی یہ اعتراض کہ سیزر نے اپنی کشادہ دستی کی بدولت حکومت حاصل کی اور اسی طرح اور بہت سے لوگوں نے بڑے بڑے رتبے کشادہ دستی اور شہرت کشادہ دستی سے حاصل کیے تو میرا جواب یہ ہو گا کہ تو آپ پہلے سے بادشاہ ہیں یا آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ اگر بادشاہ ہیں تو کشادہ دستی میں نقصان ہو گا اور اگر دوسری صورت ہے تو از بس ضروری ہے کہ لوگ آپ کو کشادہ دست خیال کریں۔ سیزر ان افراد میں سے تھا جو رومہ کی حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اگر حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے اخراجات میں کمی نہ کی ہوتی تو سلطنت تباہ ہو جاتی۔ "اور اگر کوئی یہ کہے کہ بہت سے بادشاہوں نے جو فیاض مشہور تھے اپنی فوجوں کے ذریعہ بڑی بڑی مہمیں سرکیں تو میرا جواب یہ ہو گا کہ بادشاہ جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ یا تو اس کی اور اس کی رعایا کی ملکیت ہوتی ہے یا دوسروں کی۔ پہلی صورت میں اسے کفایت شعاری اختیار کرنی چاہیے لیکن دوسری صورت میں جتنا بھی خرچ کرے کم ہے اس لئے کہ جو بادشاہ اپنی فوج کا خود سپہ سالار ہو اور لوٹ مار کے ذریعے اور زبردستی روپیہ وصول کرکے فوج کے اخراجات نکالے تو چوں کہ اس کے ہاتھ میں اوروں کی دولت آتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ خوب خرچ کرے۔ خرچ نہ کرے گا تو اس کے سپاہی کاہے کو اس کا ساتھ دینے لگے۔ غرض جو دولت بادشاہ یا اس کی رعایا کی ملکیت نہ ہو اسے خوب اڑانا چاہیے۔ جیسا سائرس، سیزر اور سکندر نے کیا۔ دوسروں کی دولت کو دل کھول کر خرچ کرنے سے شہرت میں کمی نہیں ہوتی، اضافہ ہوتا ہے۔ نقصان تب ہوتا ہے جب اپنا روپیہ خرچ کیا جائے۔ کوئی خصلت کشادہ دستی سے زیادہ تباہ کن نہیں جتنا اسے برتو گے اسی حساب سے روپیہ کم ہوتا جائے گا۔ افلاس ستانا شروع کرے گا اور

لوگوں کی نظر میں عزت باقی نہیں رہے گی اور افلاس سے بچنا چاہو گے تو دوسروں پر زبردستی کرو گے اور لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ ان دو نتیجوں میں سے ایک یقینی ہے اور بادشاہ کو ان سے بچنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کنجوس کہے تو کہا کرے' بدنامی سہی' نفرت تو نہ ہوگی لیکن کشادہ دست مشہور ہونے کی خاطر مجبوراً" لوٹ مار پر آمادہ ہونا جس سے نفرت بھی پیدا ہو اور بدنامی بھی ہو' بہت برا ہے۔

❂ □ ❂

باب ۱۷

سنگ دِلی اور رحم دلی' بہتر کیا ہے؟ لوگ محبت کریں کہ ڈریں؟

اب بعض اور اوصاف کو لیجئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے میری رائے میں ہر بادشاہ کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ لوگ اسے سنگ دل خیال نہ کریں بلکہ رحم دل سمجھیں۔ مگر اس خصلت کے غلط استعمال سے بچنا چاہیے سیزارے بورژیا سنگ دل مشہور تھا۔ مگر یہ سنگ دلی ہی تو تھی کہ روماناکو پھر سے اتحاد نصیب ہوا۔ وہاں امن و امان کا دور دورہ ہوا اور اس کی اطاعت کی گئی۔ پس اگر ہم ان چیزوں کا صحیح جائزہ لیں گے تو معلوم ہو گا کہ وہ اہل فلورنس سے کہیں زیادہ رحم دل تھا۔ جنہوں نے سنگ دلی کے الزام سے بچنے کی خاطر پستوئیا کو فریق بندیوں سے تباہ ہو جانے دیا۔ (۱)

پس بادشاہ کو سنگ دل مشہور ہونے کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس سے وہ اپنی رعایا کو متحد اور مطیع و فرماں بردار رکھ سکے۔ جو کوئی دو ایک دفعہ سختیاں کر کے فتنہ و فساد کا خاتمہ کر سکے۔ وہ آخر کار ایسے بادشاہ سے زیادہ رحم دل ثابت ہو گا۔ جو نرمی سے ڈھیل دیئے چلا جاتا ہے اور جس کا نتیجہ لوٹ مار اور خون خرابا ہوتا ہے ایسی

---

(۱) اہل فلورنس مختلف فرقوں کے سرداروں کو قتل کرنے سے ڈرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۰۲ء میں بہت زیادہ گڑبڑ اور فسادات ہوئے۔ لوٹ مار کی کوئی حد نہ رہی اور ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔

نرمی سے پوری مملکت کو نقصان پہنچتا ہے برخلاف اس کے سختیوں کا اثر صرف چند افراد پر پڑتا ہے۔

نئے بادشاہ کے لئے تو خاص طور پر اس بدنامی سے (کہ وہ سنگ دل ہے) بچنا ناممکن ہے کہ اس لئے کہ نئی ریاستیں خطروں میں گھری ہوئی ہیں چنانچہ ورجل ویدو کی زبان سے یوں اپنے حال کا اظہار کرتا ہے۔

ادھر ہے نامہربان قسمت ادھر حکومت نئی نئی ہے
اسی لئے میں نے حکمرانی کی یہ روش اختیار کی ہے

پھر بھی بادشاہ کو یہ سزاوار نہیں کہ کان کا کچا ہو یا آسانی سے کسی بات پر آمادہ ہو جایا کرے۔ اس کا کام یہ ہے کہ دانشمندی کے دامن میں رحم دلی کا پیوند اس طرح لگائے کہ نہ تو دوسروں پر بہت زیادہ اعتماد کرنے سے اسے اپنی حفاظت کی فکر نہ رہے اور نہ بلاوجہ اتنی بے اعتمادی ہی ٹھیک ہے کہ اپنے آپ کو ناقابل برداشت بنادے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہتر کیا ہے۔ محبت نظر سے دیکھا جانا یا خوف کی نظر سے؟ صحیح جواب تو یہ ہے کہ دونوں ہوں تو کیا کہنے مگر محبت اور خوف دونوں کا اس طرح یکجا ہو جانا قریب قریب ناممکن ہے اور جب ان میں ایک کا انتخاب لازمی ہو تو یہ کہیں بہتر ہے کہ لوگ محبت کی بجائے ڈرتے رہیں۔ اس لئے کہ لوگ عام طور پر ناشکرگزار، متلون مزاج اور ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔ وہ خطرے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور نفع کی لالچ ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جب تک آپ سے انہیں نفع پہنچتا رہے اس وقت تک آپ کا دم بھرتے ہیں اور جب کوئی فوری ضرورت نہیں ہوتی، آپ کی خاطر خون بہانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اپنا مال اور اپنی جانیں اور اپنی اولاد کو قربان کرنے پر تیار نظر آتے ہیں۔ مگر جب واقعی ایسا کوئی موقع

پیش آتا ہے تو آپ کے مخالف بن جاتے ہیں پس جو بادشاہ اپنی حفاظت کا کوئی اور انتظام نہیں کرتا اور جن کا محض ان کے اظہار وفاداری پر دارومدار ہے۔ اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس لئے کہ جو دوستی کسی قیمت پر خریدی گئی ہو اور جو اپنی عظمت اور اخلاقی بڑائی سے نہ حاصل کی گئی ہو اس سے کام نہیں نکلا کرتا۔ اور ضرورت کے وقت وہ بالکل بیکار ثابت ہوا کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر لوگ ایسے بادشاہ کو خفا کرنے میں کم احتیاط سے کام لیتے ہیں جو اپنے آپ کو ہردلعزیز بنانے کی کوشش کرتا ہے بمقابلہ اس بادشاہ کے جو اپنا خوف لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ محبت کا بندھن ہے احسان شناسی اور انسان جو کہ عام طور پر بدی کی طرف مائل ہے' جہاں ذرا بھی اپنے مفاد کا سوال آتا ہے وہ اسے پاش پاش کر دیتا ہے۔ مگر خوف کا تعلق سزا سے اور یہ آسانی سے نہیں بھلائی جا سکتی۔

البتہ بادشاہ کو لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف اس طرح پیدا کرنا چاہیے کہ اگر ان کی محبت حاصل نہ ہو تو خیر مگر وہ ان کی نفرت کا شکار نہ ہو اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ لوگ کسی شخص سے خائف ہوں اور اس سے نفرت نہ کریں اور یہ اس صورت میں ہو گا جب وہ اپنے شہریوں اور اپنی رعایا کی جائیدادوں اور ان کی عورتوں پر دست درازی نہیں کرے گا اور اگر وہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے پر مجبور ہو گا تو صرف اس صورت میں جب اس کا سبب ہر کوئی دیکھ سکے اور خاطر خواہ عذر موجود ہو۔ مگر خاص طور پر اسے دوسرے کی ملکیت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یوں کہ انسان اپنے باپ کی موت تک بھلا سکتا ہے۔ مگر اپنے ملک کا نقصان اس سے نہیں بھلایا جاتا۔ پھر یہ کہ جائیدادیں ضبط کرنے کے بہانوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ اور جب ایک دفعہ دوسرے کی ملک کا مزہ لگ جائے تو پھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے برخلاف اس کے کہ خون بہانے کے اسباب تعداد میں کم ہوتے ہیں اور نسبتاً" جلد ختم ہو جاتے ہیں لیکن جب

کوئی بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ ہو اور اس کے ماتحت بہت سے سپاہی ہوں تو اسے سنگدلی
کے الزام کی ذرا پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ بغیر اس قسم کی شہرت کے کوئی
سردار اپنی فوج کو نہ تو متحد رکھ سکتا ہے اور نہ فرائض احساس ان میں جاگزیں کر سکتا
ہے ہنی بال میں جہاں اور بہت سی ممتاز خصوصیات تھیں وہاں یہ بھی تھی کہ گو اس کی
فوج بہت بڑی تھی اور وہ مختلف اقوام کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ پھر جنگ کرنے کے لئے
اسے ایک غیر ملک میں لایا گیا تھا مگر تمام باتوں کے باوجود نہ تو ان میں آپس میں مناقشہ
ہوا اور نہ انہوں نے کبھی اپنے سپہ سالار کے خلاف بغاوت کی۔ حالانکہ ہنی بال پر اچھے
وقت بھی آئے اور برے وقت بھی۔ اس کا سبب سوائے سنگ دلی کے اور کچھ نہ تھا۔
ہاں اس خصلت کے ساتھ ان گنت خوبیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے اس کے سپاہیوں
کے دلوں میں اس کی بے انتہا عزت تھی اور غیر معمولی دہشت۔ اگر وہ بے رحم مشہور
نہ ہوتا تو محض دوسرے اوصاف سے اس طرح کے نتیجے بر آمد نہ ہوتے۔ ناسمجھ مصنف
اس کے کارناموں کی تعریف میں تو رطب اللسان ہیں مگر اصل سبب کی بہت برائی
کرتے ہیں۔ یہ بات کہ اس کو دوسری خوبیاں بجائے خود کبھی اتنی موثر ثابت نہیں
ہوئیں۔ سیپیو کی مثال سے واضح ہو جاتی ہے سیپیو نہ صرف اپنے زمانے بلکہ دنیا کی
تمام تاریخ کے عظیم ترین سپہ سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہسپانیہ میں اس کی فوجوں
نے بغاوت کی (۱) وجہ صرف اتنی تھی کہ اس نے ان کے ساتھ بہت زیادہ نرمی کا برتاؤ
کیا۔ اور انہیں وہ آزادیاں دیں جو فوجی ضابطہ کے برخلاف تھیں یہی وہ الزام تھا جو
فابیں ماکسی مس نے سینیٹ کی مجلس میں اس پر لگایا اور اسے رومہ کی سپاہ کو خراب
کرنے والے کا لقب دیا۔

---

(۱) واقعہ ہے ۲۰۶ ق۔ م کا

اسی طرح جب لوچری کے باشندوں پر اس کے ایک نائب (۱) نے نہایت ہی شرمناک مظالم ڈھائے تو اس نے نہ تو کوئی باز پرس کی اور نہ اپنے نائب کو اس کی زیادتی کی سزا دی۔ سبب وہی تھا' یعنی اس کی طبیعت کی لاپرواہی۔ اسی پر کسی نے جو اس کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے سینیٹ میں کہا کہ ایسے افراد کی تعداد بہت بڑی ہے جو خود غلطی کا ارتکاب کرنے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا جانتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ دوسروں کی غلطی کرنے سے کیونکر روکیں اگر سیپیو کی طبیعت کا اندازہ یہی رہتا اور فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں رہتی تو آگے چل کر ضرور اس کی شہرت اور ناموری کو بھی بٹہ لگتا۔ مگر وہ تو سینیٹ کے ماتحت تھا اور اس وجہ سے اس نقصان دہ خصلت پر نہ صرف پردہ پڑا رہا بلکہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

آخر میں اس سوال کے جواب میں کہ "محبت بہتر ہے یا دہشت؟" میں بطور خلاصہ کے بس اتنا کہوں گا کہ بادشاہ سے محبت کا دارومدار ہے رعایا پر۔ اور دہشت کا دارومدار ہے خود اس پر۔ تو عقلمند بادشاہ کو ان بنیادوں پر عمارت کھڑی کرنی چاہئے جو اس کے اختیار میں ہوں۔ نہ ان پر جن پر دوسروں کا اختیار ہو۔ البتہ نفرت سے بچنے کے لئے اسے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

---

(۱) مراد ہے پلے مینیس جس نے اس شہر کو بری طرح لوٹا۔ حالانکہ اس کا ذمہ کار تھیجیوں سے اس کی حفاظت تھی اس نے بہت سے معزز لوگوں کو قتل کروا دیا۔

باب ۱۸

بادشاہ اور وفائے عہد

ہر شخص کو اس سے اتفاق ہو گا کہ بادشاہ کے لئے عہد و پیمان پر قائم رہنا' راست بازی اختیار کرنا اور دغاو فریب سے کنارہ کشی اختیار کرنا نہایت ہی قابل تعریف ہے۔ مگر ہمارے زمانے میں جو واقعات پیش آئے ہیں' ان میں خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایسے بادشاہوں نے جنھوں نے عہد و پیمان کی کبھی پرواہ نہ کی اور دوسرے کو دھوکے اور فریب سے نیچا دکھایا۔ بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اور وہ بادشاہوں سے کہیں بہتر رہے جنھوں نے راست بازی کو اپنا شعار بنایا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ مقابلہ دو طرح ممکن ہے بزور قانون یا بزرو بازو۔ ان میں سے پہلا طریقہ انسان کے لئے اور دوسرا طریقہ حیوانوں کے لئے موزوں ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ پہلا طریقہ اکثر ناکام ہوتا ہے۔ اس لئے بادشاہ کو دونوں طریقوں کا معقول استعمال جاننا چاہیے۔ یہ سبق قدیم مصنفوں نے ہمیں پوشیدہ طور پر سکھایا ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ کہ اچی لیز اور قدیم بادشاہوں میں سے اور بھی بہت سارے کس طرح تربیت کے لئے سنتو چیرن[۱] کے حوالہ کر دیئے گئے تھے۔

ایسا استاد رکھنے کے جو نصف انسان ہو اور نصف حیوان بس ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں وہ یہ کہ بادشاہ کے لئے دونوں خصلتیں ضروری ہیں اور یہ کہ ایک کو

---

(۱) سنتور یونانی خیال کے مطابق ایک خیالی جاندار ہے اور نصف اسپ اور نصف انسان سمجھا جاتا ہے۔

دو سرے کے بغیر استقلال ممکن نہیں۔

مگر چونکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بادشاہ حیوانی صفات کا استعمال عقلمندی کے ساتھ کرے۔ اسے نمونہ کے طور پر شیر وروباہ دونوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ اس لئے کہ شیر اپنے آپ کو جال سے نہیں بچاسکتا اور لومڑی بھیڑیوں کے مقابلہ میں لاچار ہوتی ہے۔ چنانچہ جال کا پتہ لگانے کے لئے لومڑی اور بھیڑیوں کو بھگانے کے لئے شیر بننے کی ضرورت ہے۔

محض شیری پر بھروسہ کرنا کوئی دانائی کی بات نہیں۔ چنانچہ بادشاہ کے لئے نہ تو یہ ممکن ہے اور نہ اسے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے عہد و پیان پر اس صورت میں بھی قائم رہے جب ایسا کرنے سے اسے نقصان پہنچتا ہوں اور عہد و پیان کرنے کے جو اسباب تھے وہ باقی نہ رہے ہوں۔ سب انسان نیک ہوتے تو یہ مشورہ غیر مناسب ہوتا۔ مگر لوگ تو اکثر بے ایمان ہوتے ہیں وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہتے تو بادشاہ کیوں اتنی سختی کے ساتھ عہد کی پابندی کرے۔ عہد توڑنا ہو تو بادشاہ ہزار بہانے تلاش کر سکتا ہے زمانہ حال میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ کتنے عہد نامے اور قول و قرار تھے جن کو بادشاہوں نے توڑا اور اس وجہ سے وہ بیکار اور بے معنی ثابت ہوئے۔ بادشاہ لومڑی کی طرح چالاک ہو تو کامیابی اس کے قدم چومے گی۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس صفت کو اچھے رنگ میں پیش کیا جائے اور بناوٹ اور حیلہ سازی میں خاص مہارت پیدا کی جائے۔ لوگ اس قدر بھولے ہوتے ہیں اور فوری ضرورت سے اتنا متاثر کہ اگر انہیں کوئی دھوکہ دینے کی دل میں ٹھان لے تو اسے دھوکہ کھانے والوں کی کمی کی کبھی شکایت نہ ہونے پائے گی۔ زمانہ حال کی ایک مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پوپ الگزانڈر کا بس ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی دھن۔ وہ یہ کہ کس طرح دوسروں کو دھوکا دے۔ تختہ مشق بننے کو اسے ہیشہ کوئی نہ کوئی ملتا رہا

اس سے پہلے شاید ہی کبھی کوئی شخص گزرا ہو جس نے اتنی شد تکے ساتھ بڑے بڑے دعوے کرے اور ایمان کا حوالہ دے کر قول و قرار کیے ہوں۔ گو وعدے وفا کرنے کا ذرا بھی ارادہ نہ ہو مگر باوجود ان تمام باتوں کے' چونکہ وہ انسانی فطرت کی اس کمزوری کو خوب سمجھتا تھا دغا و فریب میں اسے ہمیشہ کامیابی ہوتی رہی۔

یہ ضروری نہیں کہ بادشاہ میں وہ سب خصائل جمع ہوں جو میں نے اوپر گنائے ہیں مگر ظاہرا طور پر ایسا معلوم ضرور ہونا چاہیے کہ وہ سب اس میں موجود ہیں۔ یہی نہیں میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ بادشاہ میں یہ سب خصائل واقعی جمع ہونے اور اس کے عمل میں ہمیشہ ان کا اظہار ہونے سے نقصان کا ڈر ہے لیکن اگر صرف ظاہر میں ایسا دکھلائی دے تب البتہ مفید ہو گا۔ چنانچہ یہ اچھی بات ہے کہ بادشاہ رحم دل' دیانت دار' حلیم' دیندار اور راست باز معلوم ہو اور واقعی ہو بھی' مگر اس کا مزاج کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ اگر کسی موقع پر ان اوصاف سے بات بنتی نظر نہ آئے تو ان خصائل سے کام نکالے جو ان کی ضد ہیں۔

یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ بادشاہ اور خاص طور پر نیا بادشاہ ان تمام اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا جو انسان کو نیک سمجھ کر وضع کیے گئے ہیں۔ اپنی بادشاہت برقرار رکھنے کے لئے وہ اکثر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایفائے عہد' نیکو کاری' بھلمنسی اور دینداری کو خیرباد کہے۔ اس لئے اپنے رویہ میں تبدیلی کے لئے اسے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ قسمت الٹا پلٹا کھائے تو وہ بھی اپنا رخ بدل دے۔ البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جب تک ممکن ہو' نیکی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے مگر جب اسے ترک کرنا ضروری ہو تو یہ بھی بے باکی کے ساتھ کرے۔

بادشاہ کو چاہیے کہ وہ کبھی ایسی بات زبان پر نہ لائے جس میں متذکرہ بالا پانچ خوبیاں موجود نہ ہوں' تاکہ جو کوئی اس سے ملے اور اس کی گفتگو سنے تو یہ سمجھے کہ وہ

رحم' دیانت داری' راست بازی' کرم اور دینداری کا مجسمہ ہے اور ان سب اوصاف میں آخری وصف کا نظر آنا خاص طور پر ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر لوگ آنکھ سے دیکھ کر رائے قائم کرتے ہیں۔ برت کر نہیں۔ اس لئے کہ دیکھ تو سب سکتے ہیں مگر برتنے کا موقع شاذ و نادر کسی کو ملتا ہے۔ ظاہر میں انسان جیسا نظر آتا ہے وہ ہر ایک دیکھتا ہے مگر وہ دراصل جیسا ہے اس کا پتہ بہت کم لوگوں کو چل پاتا ہے اور گنتی کے یہ چند لوگ اس بڑی جماعت کی مخالفت نہیں کر سکتے جن کی پشت پر ریاست کی تمام طاقت و جبروت ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمام افراد اور خاص طور پر بادشاہوں کے افعال کے متعلق جن کی مخالفت کرنا عقلمندی کی بات نہیں' بس نتیجوں ہی کی بنا پر رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی بادشاہ اپنی حکومت قائم کر کے اسے برقرار رکھ سکے تو پھر جو ذرائع بھی استعمال کرے وہ ٹھیک ہی خیال کئے جائیں گے۔ اور ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گا۔ اس لئے کہ عوام ظاہرا صورت پر جاتے ہیں اور نتائج سے مرعوب ہوتے ہیں اور دنیا عوام کو ٹھہری اقلیت کو دنیا میں صرف اس وقت کامیابی ہوتی ہے جب اکثریت اپنی رائے پر قائم نہیں رہتی۔

موجودہ زمانہ کا ایک بادشاہ (۱) جس کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہمیشہ صلح اور ایفائے عہد کا راگ الاپا کرتا ہے حالانکہ ان دونوں سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور اگر ان میں سے ایک پر بھی اس کا عمل ہوتا تو اس کی شہرت اور تخت و تاج کبھی کے خاک میں مل چکے ہوتے۔

---

(۱) مراد ہے فرڈیننڈ شاہ ہسپانیہ

باب ۱۹

اپنے آپ کو حقارت اور نفرت سے بچانے کے بیان

اوپر جن خصلتوں کا ذکر ہوا ان میں سے جو خاص طور پر اہم تھیں ان پر تو میں بحث کر چکا ہوں۔ اب باقی ماندہ صفات پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں بادشاہ کو ان باتوں سے خاص طور پر اجتناب کرنا چاہئے جن سے اس کے خلاف نفرت پیدا ہو یا جن سے وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہو۔ اس میں اسے جتنی کامیابی ہوگی اتنا ہی وہ سرخرو ہوگا اور پھر ادر اعتراضات کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

بادشاہ کے خلاف جن چیزوں سے سب سے زیادہ نفرت پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔ حرص' دوسروں کی ملکیت پر قبضہ جمانا' رعایا میں سے عورتوں پر دست اندازی کرنا۔ ان باتوں سے بچنا اشد ضروری ہے۔ جب تک ان کی جائیدادیں اور آبرو سلامت رہتی ہے اکثر لوگ مطمئن رہتے ہیں۔ اور بادشاہ سے مقابلہ کرتے ہیں تو گنتی کے چند ہوس مند اور انہیں وہ آسانی سے کچل سکتا ہے۔

بادشاہ کو لوگوں کی نظروں میں حقیر کرنے والی باتیں ہیں تلون' چھچھورا پن' نسوانیت' بزدلی اور تذبذب' بادشاہ کا ان برائیوں سے دور کا بھی واسطہ نہ ہونا چاہیے۔ اس کی کوشش ہمیشہ یہ رہنی چاہیے کہ اس کے تمام کاموں میں عظمت' عالی

ہمتی، دانشمندی اور طاقت کا اظہار ہو۔ رعایا کے ساتھ نجی تعلقات میں اس کے فیصلے اٹل ہونے چاہئیں اور اسکی ایسی شہرت ہونی چاہیے کہ کسی کو اسے جھانسے دینے کا کبھی گمان تک نہ گزرے۔

جو بادشاہ اپنے بارے میں ایسی رائے پھیلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی عزت ہوتی ہے اور جس کی بہت عزت ہو اس کے خلاف سازش بہت مشکل ہے۔ اسی طرح جب کسی کو غیر معمولی طور پر اچھا بادشاہ سمجھا جائے اور رعایا دل سے اس کی عزت کرے تو اس پر حملہ کرنا کھیل نہیں۔ اس لئے کہ بادشاہ کو دو طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے'ایک اندرونی یعنی اپنی رعایا کی طرف سے' دوسرا بیرونی یعنی دوسری مملکتوں کی جانب سے۔ دوسری مملکتوں سے اپنی محافظت اچھے ہتھیاروں اور اچھے حلیفوں کی مدد سے ممکن ہے۔ اور بادشاہ کے اسلحہ اچھے ہوں گے تو حلیف بھی اچھے ملتے رہیں گے اور جب بیرونی خطرہ نہ ہو گا تو مملکت کے اندر بھی امن و امان رہے گا۔ سوائے اس صورت کے سازشوں سے سکون میں خلل پڑ جائے پھر یہ کہ بیرونی حملہ بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ اگر بادشاہ کی تیاریاں سب مکمل ہوں اور اس کی حکمت عملی وہ ہو جس کا میں نے اوپر مشورہ دیا ہے تو اگر وہ خود جی نہ چھوڑ بیٹھے تو ہر حملہ کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے گا ٹھیک اسی طرح جیسا کہ نابس شاہ اسپارٹا نے کیا۔ بیرونی خوف نہ ہو تو ایک خطرہ باقی رہ جاتا یعنی رعایا میں سازشوں کا امکان ان سے بھی بادشاہ اپنے آپ کو آسانی سے.. ... محفوظ رکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ لوگوں میں اپنے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ نہ پیدا ہونے دے اور قوم کو ہر طرح خوش رکھے جیسا کہ پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ یہ باتیں بہت ضروری ہیں۔ آپ کے خلاف سازشوں کا سب سے موثر علاج یہی ہے کہ قوم کو بادشاہ سے نفرت نہ ہو اور وہ اسے حقارت کی نظر سے نہ دیکھے اس لئے کہ جو کوئی بادشاہ کے خلاف سازش کرتا ہے وہ ہمیشہ اس توقع کے ساتھ کہ بادشاہ کے ہٹنے

سے قوم کو خوشی ہوگی لیکن جب سازشی کا یہ پتہ چلے کہ اس بات سے قوم ناراض ہوگی تو اس کی ہمت پست ہو جائے گی اور وہ اپنی حرکت سے باز آئے گا اس لئے کہ سازشی کی راہ میں ہزار دقتیں ہوتی ہیں تجربہ بھی شاہد ہے کہ سازش میں کامیابی شاذ و نادر ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ سازشی تن تنہا تو کچھ کر نہیں سکتا اور اپنا شریک وہ انہیں بنا سکتا ہے جو اس کے خیال میں بادشاہوں سے بیزار ہوں اور جہاں اس قسم کے لوگوں سے اس نے اپنے دل کی بات کہی اور انہیں اپنی شکایتوں کے دور کرنے کا سامان ہاتھ آیا یہ لوگ بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کے ہزار فائدے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک راستہ اختیار کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہو اور دوسرا طریق مشتبہ اور پر خطر ہو تو سازشی کا ساتھ دینا یا تو اس کے لئے بہت ہی غیر معمولی دوست کا کام ہو سکتا ہے یا بادشاہ کے جانی دشمن کا۔

اس مسئلہ کو چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ سازشی کی جانب سوائے خوف' بدظنی اور سزا کے امکان کے کچھ اور نہیں ہوتا اور بادشاہ کی جانب بادشاہت کی شان و شوکت' قوانین' دوستوں کی حمایت اور مملکت کی پشت پناہی' غرض کیا کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں قوم کی خیر خواہی کا اضافہ کیجئے۔ پھر کون ایسا ناعاقبت اندیش ہو گا کہ سازش کرنے کا ارادہ کرے۔ اس لئے کہ سازش کی بجا آوری سے پہلے تو سازشی کو عام طور پر خوف رہتا ہی ہے مگر اس صورت میں جرم کرنے کے بعد بھی وہ خوف میں مبتلا رہتا ہے' یوں کہ وہ قوم کی دشمنی مول لے لیتا ہے اور اس کے لئے نجات کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

اس موضوع سے متعلق کتنی ہی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ مثال ہمارے اپنے آبا کے زمانہ کی ہے نبی بال بنتی دولی (یعنی موجودہ

نی بال کا دادا) جو بلونا کا بادشاہ تھا۔ جب کنیشی سازشیوں کے ہاتھوں قتل ہوا (۱) تو سوائے مسر ژبوانی کے جو اس وقت بہت کم سن تھا۔ شاہی خاندان میں سے ایک فرد بھی باقی نہ رہا۔ مگر بادشاہ کے قتل کے بعد فوراً ہی قوم اٹھی اور اس نے تمام کے تمام کنیشی سازشیوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں بلونا کے لوگ اس شاہی خاندان سے بہت خوش تھے۔ وہ اس کو اس درجہ محبوب رکھتے تھے کہ گو نی بال کے موت کے بعد اس کے خاندان میں کوئی اور شخص مملکت پر حکمرانی کے قابل نہ رہا تاہم جب اہل بونا کو یہ پتہ چلا کہ بنتی وولی خاندان کا ایک رکن فلورنس میں موجود ہے جو اس وقت تک کسی لوہار کالڑ کا خیال کیا جاتا تھا تو اسے وہاں سے بلوایا اور اپنے شہر کی حکومت اسے سونپی اور مسر ژیووانی کے سن بلوغ کو پہنچنے تک اس نے وہاں حکومت کی۔ (۲)

اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ قوم میں بادشاہ کی عزت ہو تو اسے سازشوں کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ ہاں قوم مخالف ہو اور بادشاہ سے نفرت کرتی ہو تو پھر ہر بات اور ہر ایک سے ڈرنا ضروری ہے اچھی منظم مملکتیں اور عقل مند بادشاہ ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ شرفاء ان سے بالکل مایوس نہ ہونے پائیں اور قوم بھی مطمئن اور خوش رہے۔ بادشاہ کے مقاصد میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ہمارے زمانہ میں جن مملکتوں کا رکھ رکھاؤ اور نظام حکومت سب سے بہتر ہے ان میں فرانس بھی ہے فرانس میں بہت سے ایسے معقول ادارے ہیں جن پر بادشاہ کی خود مختاری اور سلامتی کا دارومدار ہے۔ ان میں اولین پارلیمنٹ اور اس کا اختیار

---

(۱) ۲۴ جون ۱۴۴۵ء کا واقعہ ہے۔

(۲) ۱۴۴۵ء تا ۱۴۶۲ء

ہے۔(۱) اس لئے کہ جس کسی نے فرانس کا دستور بنایا وہ اگر ایک طرف شرفاء کی جاہ طلبی اور دیدہ دلیری سے بخوبی واقف تھا تو دوسری طرف اسے اس نفرت کا اچھی طرح اندازہ تھا جو خوف کی بنا پر عوام کو شرفاء کے ساتھ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ عوام کو شرفاء کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری وہ بادشاہ کے کاندھوں پر ڈالنے پر آمادہ نہ تھا عوام کی طرف داری کرنے سے شرفاء میں اور شرفاء پر لطف و کرم کرنے سے عوام میں جو بدظنی پیدا ہوتی ہے اس کی ذمہ داری وہ اپنے اوپر سے ہٹانا چاہتا تھا اس غرض سے وہ ایک غیر جانبدار ادارہ وجود میں لایا تاکہ بادشاہ کو پابند کئے بغیر شرفا کو دبایا جا سکے اور عوام کی حمایت کی جا سکے اس سے بہتر اور عقل مند تدابیر اور بادشاہ کے بچاؤ کی اس سے زیادہ کارگر صورت ممکن نہ تھی ہم اس مثال سے ایک اور اہم سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی بادشاہ کو چاہیے کہ جن معاملات میں ملامت کا ڈر ہو وہ دوسروں کے سپرد کرے اور لطف و انعام کا منبع اپنی ذات کو بنائے میں پھر اس بات پر زور دوں گا کہ بادشاہ کو شرفاء کی عزت کرنی چاہیے مگر اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو عوام کی نفرین و ملامت کا نشانہ نہ بننے دینا چاہیے۔

شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رومہ کے شہنشاہوں کی حیات و ممات کا بغور مطالعہ کرنے سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں جن سے میرے نظریئے کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کی تمام زندگیاں نیکیاں ہی نیکیاں کرتے گزری۔ مگر پھر بھی انہیں تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور سازشی رعایا کے ہاتھوں انہیں موت کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

---

(۱) مراد ہے ان عدالت ہائے عالیہ سے جو مختلف صوبوں میں فلپ دوم (۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۳ء) کے عہد میں عالم وجود میں آئیں۔

ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے میں کئی شہنشاہوں کی سیرت کی جانچ پڑتال کر کے یہ ثابت کروں گا کہ ان کے زوال کے اسباب [illegible]ے بتائے ہوئے اسباب سے ذرا بھی مختلف نہ تھے اس سلسلے میں صرف چند ایسے واقعات کو منتخب کروں گا جن پر ہر اس شخص کی نظر پڑنا لازمی ہے جو اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ اور میرا مقصد حاصل ہو جائے گا اگر میں ان شہنشاہوں کو منتخب کروں جنھوں نے مارکس (۱) فلسفی کے زمانہ سے لے کر رکسی مسیمس (۲) کے زمانہ تک حکومت کی۔ نام یہ ہیں۔

مارکس۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کمودس (۳) پھر پرتی ناکس (۴) جولیانس (۵) زیویریس (۶) اور اس ک بیٹا انتونی نس کراکلا (۷) 'مکرینس (۸)' ہیلیو گابلس (۹) الکزانڈر (۱۰) اور مکسی مینس۔

یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ اور بادشاہتوں میں تو بس شرفا کی جاہ طلبی اور عوام الناس کی خیرہ سری سے مقابلہ ہوتا ہے مگر شہنشاہان رومہ کے لئے ایک اور دشواری بھی تھی، انہیں اپنی سپاہ کے مظالم اور طمع کو پیش نظر رکھنا ہوتا تھا' اس سے طرح طرح کی دقتیں پیدا ہوتی تھیں' یہاں تک کہ بہت سے بادشاہوں کی تباہی کا یہی سبب ہوا۔ اس لئے کہ یہ تقریباً" ناممکن تھا کہ وہ فوج اور عوام الناس دونوں کو خوش رکھ سکیں۔ عوام امن وامان کے دلدادہ تھے اور اس وجہ سے وہ نرم مزاج بادشاہوں کو ترجیح دیتے تھے مگر فوج کو جنگ جو بادشاہ مرغوب تھے۔ چاہے وہ کتنے ہی بے رحم' متکبر اور غارت گر کیوں نہ ہوں۔ فوج تو یہی چاہتی تھی کہ بادشاہ ان خصائل کا استعمال جی کھول کر قوم کے خلاف کرتی رہے تاکہ سپاہیوں کو دوگنی چوگنی تنخواہیں اور ہوسناکی اور جبر کا موقع مل

---

(۱) ۱۶۱ تا ۱۸۰ء (۲) ۲۳۵ تا ۲۳۸ء
(۳) ۱۸۰ء تا ۱۹۲ء (۴) ۱۹۳ء
(۵) ۱۹۳ تا ۲۰۲ء (۶) ۲۰۲ تا ۲۱۱ء
(۷) ۲۱۲ تا ۲۱۷ء (۸) ۲۱۷ تا ۲۱۸ء
(۹) ۲۱۸ء تا ۲۲۲ء (۱۰) ۲۲۲ تا ۲۳۵ء

سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے شہنشاہ ہمیشہ تباہ و برباد ہوتے رہے جن میں پیدائشی طور پر یا تربیت کی بدولت یہ صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ فوج اور عوام الناس دونوں کو قابو میں رکھ سکتے۔ ان میں سے اکثر کا اور خاص طور پر ان کا جنہیں نئی نئی بادشاہیں ملی تھیں یہ طریقہ رہا کہ جب اس تضاد کی وجہ سے انہیں وقتوں کا سامنا ہوا تو انہوں نے فوج کو خوش کرنے کی ٹھانی اور قوم کو اس سے جو نقصان پہنچا اس کی ذرا پرواہ نہ کی ان کے لئے یہ راہ اختیار کرنا تھا بھی ضروری۔ یوں کہ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی بھی بادشاہ سے نفرت نہ کرے۔ البتہ بادشاہوں کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ رعایا میں سے کوئی مستقل جماعت ان سے نفرت نہ کرنے لگے اور اس میں ناکامی ہو تو پھر انہیں نسبتاً" زیادہ طاقت ور جماعت کی نفرت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ رومہ میں جو شہنشاہ نئے نئے حکمران بنے تھے اور اس وجہ سے خاص طور پر حمایت کے محتاج تھے۔ انہوں نے قوم کے مقابلہ میں فوج کا ساتھ دیا اس پالیسی سے کبھی فائدہ ہوا اور کبھی نقصان۔ بادشاہ اپنا اقتدار جما سکا تو فائدہ میں رہا' نہیں تو نقصان میں۔

یہی سبب تھا کہ مارکس' برتی ناکس اور الکزانڈر جو نرم مزاج' انصاف دوست' ظلم و تعدی کے دشمن' خلیق اور رحم دل تھے۔ ان میں سے مارکس کے علاوہ باقی دونوں کا انجام نامبارک ہوا۔ نہ صرف زندگی میں بلکہ موت کے بعد بھی مارکس کی بڑی عزت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے شہنشاہیت ورثہ میں ملی تھی' فوج یا قوم کی مہربانی سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا جن کی بنا پر اس کا بہت زیادہ احترام ہوتا تھا اور اس وجہ سے دونوں فریقوں کو حدود کے اندر رکھنے میں اسے کامیابی نصیب ہوئی اور خود نفرت و حقارت کا شکار نہ ہوا۔

مگر پرتی ناکس فوج کی مرضی کے خلاف شہنشاہ منتخب ہوا تھا اس سے پہلے کمودس کے ماتحت فوج بالکل بے لگام رہ چکی تھی وہ کس طرح آسانی سے ضابطہ کی زندگی

اختیار کرتی اور کمودس کے جانشین کی یہی کوشش تھی۔ قوم اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس کے بڑھاپے کی وجہ سے قوم پر اس کا کوئی رعب نہ تھا۔ چنانچہ اس کی حکومت شروع ہی ہوئی تھی کہ تباہی نے آن گھیرا۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نفرت صرف برے کاموں ہی کے سبب پیدا نہیں ہوا کرتی۔ اچھے کاموں کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے تو میں نے پہلے کہا ہے کہ حکومت قائم رکھنے کے لئے بادشاہ کو اکثر نیکی کا ساتھ چھوڑ کر برائی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ جماعت بد اطوار ہو جس کی امداد پر ہر بات کا دارومدار ہے۔ چاہے وہ جماعت عوام پر، چاہے فوج اور چاہے شرفا پر مشتمل ہو تو ضروری ہے کہ بادشاہ اس جماعت کے ساتھ نباہ کی صورت پیدا کرے اور اس کی ہر طرح تشفی کرے۔ ایسی صورت میں نیکی سے کام نہ چلے گا۔

اب الکزانڈر کو لیجئے وہ اس قدر انصاف پسند تھا کہ اس کی مدح و ثنا کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ گو وہ چودہ برس اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا مگر بغیر قانونی کارروائی کے ایک شخص بھی جان سے نہ مارا گیا۔ تاہم چونکہ لوگ اسے زنخا سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اپنی ماں کے اشارہ پر چلتا ہے اس لئے وہ لوگوں کی نظر میں بہت حقیر ہو گیا اور فوج نے سازش کر کے اسے قتل کر ڈالا۔

اب اگر کمودس، زیویریس، انتونی نس، کراکلا اور مکی مینس پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ سب کے سب نہایت ہی ظالم اور غارت گر شہنشاہ تھے۔ اپنی فوج کو خوش کرنے کی خاطر قوم پر کسی طرح کا بھی ظلم کرنے سے انہیں ذرا عار نہ تھا۔ سوائے زیویریس کے ان سب کا انجام برا ہوا۔ البتہ زیوریس میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں کہ قوم پر اس نے طرح طرح کے مظالم توڑے مگر فوج سے دوستی پیدا کر کے وہ آخر تک بہت کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اس میں بعض ایسے اعلیٰ اوصاف پائے جاتے تھے کہ

کیا قوم اور کیا سپاہ سب ہی اس کے ثناخواں تھے۔ اس کا کچھ ایسا رعب تھا کہ ایک طرف ہجوم کی آنکھیں چکاچوند ہوگئیں اور دوسری طرف فوج حد درجہ مودب اور خاموش نظر آنے لگی۔ اس اعتبار سے کہ اسے بادشاہت نئی نئی ملی تھی' اس کے کارنامے نہایت عظیم الشان تھے۔ میں ابھی یہ مختصر طور پر بتاؤں گا کہ وہ کتنی کامیابی کے ساتھ شیر و روباہ دونوں کا پارٹ کر سکتا تھا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بادشاہ کو ان دونوں صفات کا مالک ہونا چاہیے۔

زیویرس کو شہنشاہ جولین کے نکمے پن کا پتہ تھا۔ چنانچہ اسکلاودینا میں اس کے زیر کمان فوج تھی اسے رومہ کی طرف بڑھنے اور پرتی ناکس' وہی پرتی ناکس جو پریتوری سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا' اسکا بدلہ لینے پر آمادہ کرلیا اس بہانے سے اور یہ ظاہر کئے بغیر کہ وہ تخت کا خواہاں ہے وہ رومہ کی طرف فوج بڑھالایا پیشتر اس کے کہ یہ پتہ چل سکے کہ وہ چل پڑا ہے' وہ اطالیہ میں داخل ہوگیا۔ رومہ پہنچا تو سینٹ نے خوف کے مارے اسے شہنشاہ منتخب کیا اور جولین کو قتل کروا ڈالا۔ اب زیویرس کو یہ شوق چڑ آیا کہ پوری سلطنت کا مالک بنے۔ مگر اس کی راہ میں دو دقتیں حائل تھیں۔ ایک مشرق میں جہاں ایشیائی فوج کے سپہ سالار نگر نے اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کردیا تھا اور دوسری مغرب میں جہاں البینس تھا اور اسے بھی تخت حاصل کرنے کی آرزو تھی دونوں پر بیک وقت حملہ کرنے میں خطرہ تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ نگر پر تو حملہ آور ہو اور البینس کو چکمہ دے چنانچہ البینس کو اس نے یوں لکھا کہ سینیٹ نے اسے زیویرس کو شہنشاہ منتخب کیا ہے مگر وہ اس اعزاز میں البینس کو شریک کرنے پر تیار ہے اور اسی وجہ سے اس نے اس کے نام سیزر کا لقب روانہ کیا ہے۔ نیز سینیٹ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ وہ البینس کو اپنا شریک کار بنائے۔ البینس کو ان تمام باتوں کا یقین آگیا لیکن جب زیویرس نے نگر پر فتح پالی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور

مشرقی معاملات کو سلجھالیا تو وہ رومہ واپس آیا اور سینیٹ سے شکایت کی کہ البنہس اس کے تمام احسانات کو بالائے طاق رکھ کر سازش کر کے اسے قتل کروانے کی فکر کر رہا ہے اور وہ اسے اس احسان فراموشی کی سزا دینے پر مجبور ہے اس کے بعد البنہس کی تلاش میں وہ فرانس گیا اور اسے نہ صرف تمام عہدوں اور منصوبوں سے معزول کیا بلکہ اس سے اس کی زندگی بھی چھین لی۔

پس جو کوئی اس شہنشاہ کے کردار کو غور سے دیکھے گا اسے اس میں شیر کی پوری خوانخواری اور لومڑی کی تمام چالبازی نظر آئے گی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ عوام الناس اس سے کس قدر خائف تھے اور اس کی کتنی عزت کرتے تھے۔ پھر بھی فوج اس سے نفرت نہ کرتی تھی یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں کہ اس نے حکومت نئی نئی حاصل کی تھی پھر بھی وہ اتنی بڑی سلطنت پر اپنا سکہ جما سکا۔ اس کی شہرت کی آب و تاب نے اسے ہمیشہ اس ناراضگی سے محفوظ رکھا جو سفاکی اور غارت گری کے سبب لوگوں میں پیدا ہوتی ہے۔

لیکن اس کا بیٹا. انتونی بہت ہی بڑا آدمی تھا وہ نہایت ہی اعلیٰ صفات کا مالک تھا جس کی وجہ سے وہ قوم میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور فوج میں بہت مقبول تھا۔ وہ ایک جنگجو انسان تھا وہ جانتا بھی نہ تھا کہ تکان کسے کہتے ہیں۔ پر تکلف کھانوں اور دوسرے تعیّشات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے فوج اسے دل سے چاہنے لگی۔ تاہم اس کی سفاکی و خوانخواری ایسی زبردست اور انوکھی تھی کہ اس نے رومہ میں پہلے ایک ایک کر کے اور پھر ایک ساتھ بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور اسکندریہ میں کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ ساری دنیا اس سے نفرت کرنے لگی اور آس پاس کے لوگ اس سے ڈرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی وہ اپنی ہی فوج کے سامنے ایک کپتان کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی

کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر اور اپنی زندگی سے مایوس ہو کر بادشاہ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ بادشاہتوں میں کبھی بھی ایسی اموات واقع نہ ہوں اس لئے کہ جو کوئی اپنی جان عزیز نہیں رکھتا اس کے لئے بادشاہ کو قتل کرنا کوئی بری بات نہیں۔ مگر بادشاہ کو ایسے لوگوں سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ بس گنتی کے چند لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ البتہ اسے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے اپنے نوکر چاکر اور ریاست کے وہ عہدہ دار جنہیں اس سے قرب حاصل ہو انہیں کوئی بڑا نقصان نہ پہنچنے پائے۔ انتونی نس نے اس اصول کا خیال نہ رکھا اور اس کپتان کے ایک بھائی کو ذرا سی بات پر قتل کر ڈالا اور کپتان کو بھی آئے دن دھمکیاں دیتا رہا مگر اسے اپنے باڈی گارڈ میں رہنے دیا۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ بہت ہی ناعاقبت اندیشی کی بات تھی اور یہی شہنشاہ کی بربادی کا باعث ہوئی۔

اب کمودس کی زندگی پر نظر ڈالئے۔ اس کے لئے سلطنت کو قائم رکھنا ذرا بھی دشوار نہ ہونا چاہیا تھا۔ مارکس کے بیٹے کی حیثیت سے اسے سلطنت ورثہ میں ملی تھی اور قوم اور سپاہ کو خوش رکھنے کے لئے اسے بس اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس کو کیا جائے کہ اس کی طبیعت میں سفاکی اور بے دردی تھی۔ قوم کو لوٹنے کی خاطر وہ فوج کو ہر طرح کی ڈھیل دیتا رہا اور ان کی بدعنوانیوں سے چشم پوشی کرتا رہا۔ برخلاف اس کے وہ اپنی عزت قائم نہ رکھ سکا کبھی پیشہ ور تیغ زنوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے تماشاگاہ میں کود پڑتا اور کبھی دوسری چھچھوری حرکتیں کرتا جو کسی طرح شہنشاہ کے شایان شان نہ تھیں۔ اس طرح وہ فوج کی نظر میں ذلیل ہو گیا جب ایک جماعت کو اس سے نفرت ہو گئی اور دوسری اسے حقیر سمجھنے لگی تو پھر وہ سازشوں کا شکار ہوا اور جان سے مارا گیا۔

اب ایک ماکسی مینس کی سیرت کا مطالعہ باقی ہے۔ وہ بہت جنگجو انسان تھا۔ الگز انڈر کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ الگز انڈر کی فوج نسائیت سے متنفر تھی۔ اس لئے اسے قتل کر دیا اور اس کی جگہ ماکسی مینس کو شہنشاہ بنایا۔ مگر اس منصب جلیلہ پر وہ بہت دنوں فائز نہ رہ سکا دو باتوں نے اس کے خلاف نفرت اور حقارت پیدا کی۔ اس کے ذلیل سمجھے جانے کی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانہ میں وہ تھریس میں بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم تھی اور ہر شخص اسے بڑی بے عزتی کی بات سمجھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے رومہ میں اور دوسرے مقامات پر عہدہ داروں کے ذریعہ جو جو مظالم کئے ان کے سبب سے اس کی انتہائی سفاکی و خونریزی کا چرچا چاروں طرف ہو گیا۔ چنانچہ ساری دنیا میں اس کی رذالت کے سبب سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور اس کی بربریت نے سب پر خوف طاری کر دیا۔ پہلے افریقہ میں بغاوت ہوئی پھر سینیٹ اور اہل رومہ اور آخر میں تمام ملک اطالیہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سازش میں اس کی فوج بھی شریک ہو گئی۔ اس وقت فوج عقیلہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے جس کا سر کرنا کچھ آسان نہیں تھا۔ ایک تو اس کی سفاکی سے سپاہیوں میں خفگی پیدا ہوئی اور دوسرے اب جبکہ اتنی بڑی تعداد اس کی مخالف تھی ان کو اس کا زیادہ ڈر بھی نہ رہا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔

ہیلیو گابلس، مکرینس اور جولین پر بحث کرنا بے سود معلوم ہوتا ہے یہ سب کے سب نہایت ناکارے تھے اور جلد ہی ان کو رفع دفع کر دیا گیا مگر اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک بات کہوں گا۔ ہمارے زمانے کے بادشاہوں کے لئے فوج کو راضی رکھنا پہلے کے مانند ضروری نہیں اس لئے کہ گو فوج کا کچھ نہ کچھ لحاظ اب بھی ضروری ہے مگر یہ ضرورت بہت دنوں باقی نہیں رہا کرتی۔ اس لئے کہ موجودہ

بادشاہوں کے پاس ایسی فوجیں نہیں جن کا تعلق سلطنت رومہ کی فوجوں کی طرح حکومت کی نشوونما اور ریاست کے نظم ونسق میں پورا پورا حصہ رہا ہو۔

گذشتہ زمانہ میں قوم کے مقابلے میں فوج کو مطمئن رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ مگر اب شہریار ترکیہ اور سلطان (۱) کے علاوہ اور بادشاہتوں کے لئے زیادہ ضروری ہے کہ فوج کی بہ نسبت قوم کو خوش رکھنے کی تدبیریں کریں' اس لئے کہ قوم اب زیادہ طاقتور ہے۔

مندرجہ بالا کلیہ سے میں نے شہریار ترکیہ کو مستثنیٰ کیا ہے اس لئے کہ وہ بارہ ہزار پیادہ فوج اور پندرہ ہزار سوار ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہے۔(۲) انہیں پر اس کی بادشاہت کی سلامتی اور طاقت کا دارومدار ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ قوم کا ذرا بھی خیال کئے بغیر وہ فوج سے دوستی برقرار رکھے سلطان کی بادشاہت بھی اسے سے مشابہ ہے فوج کا اس پر پورا پورا قبضہ ہے بس سلطان کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قوم کے مفاد کو نظرانداز کرکے فوج کو خوش رکھنے کی ہر ممکن سعی کرے۔ مگر یہ یاد رہے کہ سلطان کی مملکت تمام بادشاہتوں سے مختلف ہے یوں کہ یہ عیسائی پاپائیت کی طرح ہے جسے نہ تو موروثی بادشاہت کہا جاسکتا ہے اور نہ نئی قائم شدہ۔ اس لئے کہ پرانے بادشاہ کے بیٹے وارث نہیں ہوتے۔ وارث وہ ہوتا ہے جسے انتخاب کا حق رکھنے والے منتخب کریں اور بیٹے محض جماعت شرفاء کے رکن ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ چونکہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اس کو نئی قائم بادشاہت نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ وہاں وہ دشواریاں نہیں پیش آتیں جن سے نئے بادشاہوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بادشاہ نیا سہی

---

(۱) مراد ہے سلطان مصریہ حکومت ۱۵۱۷ء میں ختم ہوئی۔

(۲) اشارہ ہے "جاں نثاروں" کی طرف۔

مملکت کا دستور تو پرانا ہے اور وہ اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ نئے بادشاہ کو ایسی حیثیت حاصل ہو گویا کہ وہ موروثی بادشاہ ہے۔

آیئے پھر موضوع بحث کی طرف لوٹیں جو کوئی ان خیالات پر غور کرے گا اس کو تسلیم کرنے پڑے گا کہ نفرت اور نفرت نہیں تو حقارت۔ مندرجہ بالا شہنشاہوں کی تباہی کا باعث ہوئی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لے گا کہ کس طرح ان میں سے بعض نے ایک رویہ اختیار کیا اور بعض نے اس کا بالکل متضاد رویہ۔ پھر ان دونوں اقسام میں سے صرف ایک ایک بادشاہ کا تو اچھا انجام ہوا (۱) اور باقی کا برا۔ پرتی ناکس اور الکزانڈر نئے نئے بادشاہ بنے تھے۔ مارکس کے نقش قدم پر چلنا جو موروثی بادشاہ تھا۔ ان کے لئے بے سود اور نقصان دہ تھا۔ اسی طرح کراکلہ ' کمودس اور مکسی مینس نے زیویرس کی نقل کر کے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا اس لئے کہ ان کے نقش قدم پر چلنے کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت تھی وہ ان میں موجود نہ تھیں۔ لہٰذا جو بادشاہ نئی نئی حکومت حاصل کرے۔ اسے مارکس کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ زیویرس سے وہ باتیں اخذ کرے جو مملکت کی بناڈالنے میں مدد ہوں۔ اور مارکس سے وہ جو پہلے سے مستحکم و استوار مملکت کو استقلال بخشنے میں مفید ہوں۔

---

(۱) مارکس اور زیویرس

باب ۲۰

قلعے اور اس قسم کی اور چیزیں جنہیں بادشاہ کام میں لاتے ہیں مفید ہیں یا نقصان دہ؟

مملکت پر بے خطر حکمرانی کرنے کے لئے بعض بادشاہوں نے اپنی رعایا کے ہتھیار چھین لئے ہیں۔ بعض نے فریق بندی کے ذریعہ شہروں کو اپنے قابو میں رکھا ہے۔ ایسے بادشاہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے خلاف عداوت کو بڑھایا ہے اور ایسے بھی جنہوں نے ان لوگوں کو رام کرنے کی خاص کوشش کی ہے جن پر اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں وہ اعتماد نہ کرتے تھے بعض نے قلعے تعمیر کروائے ہیں اور بعض نے قلعوں کو توڑ کر برباد کر دیا ہے۔ گو ان کے متعلق کوئی قطعی رائے اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک ان مملکتوں کے حالات سے جہاں یہ فیصلے ہوئے کماحقہ آگاہی نہ ہو۔ تاہم جس حد تک موضوع اجازت دے گا میں ان کا ذکر جامع طور پر کروں گا۔

ایسا نیا بادشاہ کوئی نہیں گزرا جس نے اپنی رعایا کو نہتا کیا ہو یہی نہیں جب کبھی اسے نہتا پایا تو ہمیشہ مسلح کیا۔ اس لئے کہ اسے مسلح کرنے سے بادشاہ کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جن پر پہلے اعتبار نہ تھا وہ وفادار بن جاتے ہیں اور جو خود وفادار تھے ان کی وفاداری میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے پاتا۔ رعایا اپنے بادشاہ کے گن گانے لگتی ہے۔ تمام رعایا کو ہتھیاروں سے مسلح کرنا تو ممکن نہیں پھر بھی بادشاہ جن کو مسلح کرے گا۔ ان کو اگر فائدہ ہو گا تو وہ دوسروں کو زیادہ آسانی سے قابو میں رکھ سکے گا۔ مسلح لوگ اس

سلوک کی وجہ سے جو بادشاہ نے ان کے ساتھ کیا ان کی طرف کھنچیں گے۔ رہے اور لوگ سو بادشاہ کو قابل معافی سمجھیں گے اس خیال سے کہ جنہیں زیادہ خطرات کا سامنا کرنا ہو اور جن کی ذمہ داری بڑی ہو انہیں صلہ بھی ویسا ہی ملنا چاہیے۔ لیکن جب بادشاہ ان سے ہتھیار چھینتا ہے تو اس پر ناراض ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ بادشاہ ان پر بھروسہ نہیں کرتا' یا انہیں بزدل سمجھتا ہے یا بے وفا۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن سے بادشاہ کے خلاف نفرت پھیلتی ہے اور مملکت غیر مسلح تو رہ نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ زر اشنا سپاہ سے کام نکالنا چاہتا ہے جن کی سیرت پر میں پہلے ہی تبصرہ کر چکا ہوں اور وہ اچھے بھی ہوں تو بہت طاقتور دشمنوں اور ناقابل اعتماد رعایا کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتے۔ اسی وجہ سے جیسا میں نے اوپر کہا ہے ہر نئی مملکت میں نئے بادشاہ نے ہمیشہ ہتھیار تقسیم کیے ہیں۔ تاریخیں اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں لیکن جب کوئی بادشاہ نئی مملکت حاصل کرے جسے وہ اپنی مملکت میں بطور ایک صوبہ کے شامل کرے تب ضروری ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے مملکت حاصل کرنے میں اس کی مدد کی اور لوگوں کے ہتھیار چھین لئے اور ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ یہ مدد کرنے والے بھی آہستہ آہستہ آرام طلب اور زنخنے بن جائیں نیز نئی مملکت میں جتنے بھی اسلحہ ہوں ان پر اس کے اپنے سپاہی قابض ہوں جو پرانے مقبوضات میں اس کی خدمت کرتے رہے ہوں۔

ہمارے آباؤ اجداد اور وہ جنہیں عاقل و دانا خیال کیا جاتا تھا اکثر کہا کرتے تھے کہ پستوئیا پر فرقہ بندیوں سے اور پیسا پر قلعوں کی مدد سے حکومت کرنی چاہیے۔ اسی خیال کے ماتحت وہ بعض باج گزار شہروں میں نفاق کا بیج بوتے رہے تاکہ ان کو آسانی سے اپنے قبضے میں رکھ سکیں ممکن ہے اس زمانے میں جب اطالیہ میں ایک طرح کا توازن قائم تھا' یہ تدبیر مناسب رہی ہو۔ موجودہ زمانہ میں اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔

اس لئے کہ میرے خیال میں فرقہ بندی سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ میرا تو یقین ہے کہ جب دشمن ایسے شہروں پر حملہ آور ہو گا جو نفاق و انتشار کا شکار ہیں تو وہ انہیں آسانی سے فتح کرے گا اس لئے کہ کمزور ترین جماعت فوجوں کا ساتھ دے گی اور دوسری جماعت مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی۔ اہل وینس نے غالباً" اس سبب سے ان شہروں میں جو ان کے ماتحت تھے پاپائی (Guelph) اور شہنشاہی (Ghibelline) فرقوں کو فروغ دیا اور گو انہوں نے کبھی خونریزی نہ ہونے دی لیکن مناقشہ اور تنازعہ کی آگ اندر لندر سلگاتے رہے تاکہ آپس کے تفرقوں کی وجہ سے وہ اہل وینس کے خلاف متحد نہ ہو سکیں مگر جیسا کہ دنیا نے دیکھا اہل وینس کی یہ توقعات پوری نہ ہو پائیں۔ اس لئے کہ وائلا (۱) کی شکست فاش کے بعد ایک جماعت نے ہمت سے کام لیا اور وہ مملکت پر قابض ہو گئی۔ پس یہ طریقے بادشاہ کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں۔ طاقتور مملکتوں میں فرقوں کو کبھی پنپنے نہیں دیا جاتا۔ ممکن ہے امن و امان کے زمانے میں نفاق سے فائدہ اٹھایا جا سکے مگر جنگ کی صورت میں یہ تدبیر نکمی ثابت ہوتی ہے۔

اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ بادشاہ دشواریوں اور دقتوں کو حل کرنے کے بعد ہی اپنی عظمت حاصل کرتے ہیں اور اس لئے جب کسی نئے بادشاہ کی قسمت جاگتی ہے جسے موروثی بادشاہ کی بہ نسبت نام پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے تو کچھ دشمن پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تاکہ اسے ان کو شکست دینے کا موقع ہاتھ آئے اور وہ ترقی کے اس زینہ پر گامزن ہو جو دشمنوں کے ہاتھوں تیار ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جب بھی موقع ملے،

---

(۱) ۱۴ مئی ۱۵۰۹ء کمبرائی کی لیگ اور وینس کی جنگ میں

عقل مند بادشاہ کو اپنے خلاف عداوت کو ایک حد تک فروغ دینا چاہیے تاکہ اس کو کچلنے سے اس کی شہرت کو چار چاند لگیں۔

بادشاہوں' خاص طور پر نئے بادشاہوں کو بہ نسبت ان لوگوں کے جن پر ابتدائے حکومت میں انہیں پورا اعتماد تھا۔ ان لوگوں میں زیادہ وفاداری اور اعانت کامادہ ملتا ہے جن پر شروع میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پان دلفو پتروچی (۱) 'شاہ سینا' اپنی ریاست پر زیادہ تر ایسے لوگوں کی مدد سے حکومت کرتا تھا جن پر دوسرے بھروسہ نہ کرتے تھے مگر اس مسئلے پر عام اصول معین کرنا مشکل ہے ہر شخص پر ایک اصول کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ بس میں اتنا کہوں گا کہ وہ لوگ جو کسی بادشاہت کے شروع ہوتے وقت اس کے مخالف تھے۔ اگر اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لئے مدد کے محتاج ہیں تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے طرف دار بنائے جاسکتے ہیں۔ ایسے لوگ بادشاہ کے ساتھ خاص طور پر وفاداری برتتے ہیں۔ تاکہ بادشاہ کو ان کے متعلق پہلے جو بدگمانی تھی وہ ان کے کردار سے دور ہوجائے۔ اس طرح بادشاہ ہمیشہ ایسے لوگوں سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو کسی قسم کا خطرہ نہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ کے کاموں سے غفلت برت سکتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق ایک اور خیال پیدا ہوتا ہے ایسے بادشاہ کو جو نئی مملکت کے حصول کے لئے وہاں کے باشندوں کا ممنون احسان ہو۔ میں یہ یاد دلائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ لوگوں کے لطف و کرم کے اسباب پر اچھی طرح غور کرے۔ اس کے ساتھ ان کا کوئی قلبی تعلق تھا یا محض سابق حکومت سے بے اطمینانی تھی۔ اگر دوسری صورت تھی تو ان سے دوستی قائم رکھنا بہت دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ انہیں مطمئن کرنا ممکن نہ ہوگا اگر قدیم اور جدید تاریخ سے مثالیں لے کے اس کے

---

(۱) سال پیدائش ۱۴۵۰ء سال وفات ۱۵۱۲ء۔ ۱۵۰۰ء میں سینا پر حکومت شروع ہوئی۔

اسباب پر غور کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بادشاہ کے لئے یہ زیادہ سہل ہے کہ ان لوگوں سے دوستی پیدا کرے جو پرانی حکومت کے ماتحت خوش اور مطمئن تھے اور اس وجہ سے اس کے دشمن ہیں۔ ان لوگوں کو دوست بنانا زیادہ مشکل ہے جنہوں نے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے نئے بادشاہ کی طرف داری کی اور اسے نئی مملکت پر قابض ہونے کے لئے اکسایا (۱)

یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ اپنی مقبوضات کو زیادہ محفوظ رکھنے کے لئے بادشاہ قلعے بنواتے ہیں۔ تاکہ سازشوں کی روک تھام ہوسکے اور انہیں اپنے ارادوں سے باز رکھا جاسکے اور اگر حملہ ہو تو یہ جائے پناہ کا کام دیں۔ یہ طریقہ قابل تعریف ہے اس لئے کہ ایک زمانہ میں نکولو دیتلی (۲) نے چیتادی کاستیلو کے دو قلعے اس لئے منہدم کروا دیئے کہ اس ریاست پر قابض رہ سکے۔ گویدا بالدو ڈیوک آف اربینو جب اپنی مملکت میں واپس آیا (۳) جہاں اسے سیزرے بورژیا نے نکال باہر کیا تھا تو اس نے اس صوبہ کے تمام قلعوں کو مسمار کروا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ قلعے نہ ہوں گے تو ملک آسانی سے ہاتھ سے نہیں جانے کا۔ بنتی وولی جب بلونا واپس آئے تو انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا (۴)

---

(۱) یہاں پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کا تعلق میکاولی کی اس آرزو سے ہے کہ میدیچی اس کو اپنی ملازمت میں لے لیں۔ ملاحظہ ہو میکاولی کا خط فرانسسکو ویتوری کے نام (مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۵۱۳ء)

(۲) پوپ سکٹس نے اسے شہر سے نکال باہر کیا تھا۔ جب پوپ کی موت کے بعد (۱۴۸۲ء میں) وہ واپس آیا اور اس نے پوپ کے بنائے ہوئے دونوں قلعے منہدم کروا دیئے۔

(۳) ۱۵۰۲ء میں

(۴) ۱۵۱۱ء میں جو قلعے مسمار کرائے گئے وہ پوپ جولیس دوم نے بنوائے تھے۔

پس قلعے مفید یا غیر مفید ہوتے ہیں حالات کے اعتبار سے ایک طرف ان سے فائدہ ہوتا ہے تو دوسری طرف نقصان۔ یوں سمجھئے کہ جو بادشاہ غیر ملکیوں کی نسبت اپنی رعایا سے زیادہ خائف ہوں اسے قلعے بنوانے چاہئیں اور جو رعایا کی نسبت غیر ملکیوں سے زیادہ ڈرتا ہو اسے اس سے باز رہنا چاہیے۔ میلان کے قلعے کی وجہ سے جن کو فرانسسکو اسفورزا نے تعمیر کروایا۔ خاندان اسفورزا کو اب تک جتنی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں اور آئندہ بھی جھیلنی پڑیں گی۔ ان کے سامنے دوسرے ہنگامے کچھ حقیقت نہیں رکھتے (۱) بس بہترین قلعہ ہے قوم کی نفرت سے بچنا۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ قلعہ پر قبضہ باقی رہے مگر یہ قبضہ بیکار ثابت ہو اور اگر بادشاہ سے قوم کو نفرت ہوگی تو یہ بیکار ہوگا اس لئے کہ ایسے غیر ملکیوں کی کبھی کمی نہ ہوگی جو بادشاہ کے خلاف لڑنے والوں کی امداد کرنے کو تیار ہوں۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے قلعے کسی بادشاہ کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئے۔ سوائے کاؤنٹس آف فورلی کے کہ اس کے شوہر کاؤنٹ ژیرو لامو کے قتل (۲) کے بعد اس نے قلعوں سے فائدہ اٹھایا۔ وہ کامیابی کے ساتھ عوام الناس کے پہلے حملے کا مقابلہ کر سکی تا آنکہ میلان سے امداد آپہنچی (۳) اور اس طرح ریاست پر اس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ صورت حالات اس وقت کچھ ایسی تھی کہ غیر ملکی باغیوں کی مدد نہ کر پائے مگر بعد میں جب سیزرے بورژیا نے اس پر حملہ کیا اور جب قوم جو اس کی دشمن تھی غیر ملکیوں

(۱) اس خاندان کے ارکین کو قلعوں پر کچھ ایسا بھروسہ تھا کہ انہوں نے قوم کی خوشنودی کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور قوم نے فرانس کو اپنا نجات دہندہ خیال کیا۔

(۲) مورخہ ۱۴ اپریل ۱۴۸۸ء

(۳) مدد پہنچائی لودووی جو اسفورزا نے؟

کے ساتھ مل گئی تو یہ قلعے اس کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئے۔ پس اس وقت بھی اور اس سے پیشتر بھی اس کے لئے یہی بہتر تھا کہ قلعوں کی بجائے اپنے خلاف قوم میں نفرت نہ پھیلنے دیتی۔ غرض موضوع کے ہر پہلو پر غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو قلعے بنوائے وہ بھی قابل تعریف ہے اور جو نہ بنوائے وہ بھی' قابل الزام میرے خیال میں وہ بادشاہ ہے جو قلعوں پر بھروسہ کرکے قوم کی نفرت کو کھیل سمجھتا ہو۔

باب ۲۱

بادشاہ ناموری کیونکر حاصل کر سکتا ہے؟

بادشاہ کی جتنی عزت بڑی مہموں اور اچھی مثال قائم کرنے سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتی۔ موجودہ زمانہ میں فرڈیننڈ اراگانی (۱) شاہ ہسپانیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسے ایک معنی میں نیا بادشاہ کہا جاسکتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ نہایت ہی غیر اہم بادشاہ تھا۔ اور اب دیکھئے تو وہ اپنی شہرت کی بدولت عالم عیسائیت کا سب سے بڑا تاجدار ہے۔ اس کے کارناموں پر نظر دوڑائی جائے تو وہ سب بہت عظیم الشان اور ان میں سے بعض تو نہایت ہی غیر معمولی معلوم ہوں گے اپنی بادشاہت کے ابتدائی زمانہ میں اس نے غرناطہ پر حملہ کیا اور اسی مہم سے دراصل اس کی عظمت کی بنیاد پڑی۔ (۲) شروع میں وہ اطمینان کے ساتھ بغیر کسی مدافعت کے خطرے کی جنگ کرتا رہا اور کاسٹیل کے جاگیرداروں کو اس میں اس طرح مصروف رکھا کہ انہیں اپنے ملک کی اندرونی تبدیلیوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ اس دوران میں غیر محسوس طور پر اس نے ان پر اپنا سکہ جمالیا اور اپنی حکومت قائم کرلی۔ کلیسا اور اپنی رعایا کے روپے سے اس نے فوج کا خرچ چلایا اور طویل جدوجہد کے دوران میں اس نے اپنے فوجی تفوق کی بنا ڈالی جس کی وجہ سے بعد میں اس نے اتنی ناموری حاصل کی۔ اس کے حوصلے

---

(۱) ۱۴۷۹ء تا ۱۵۱۶ء

(۲) ۱۴۹۲ء

اور بڑھتے گئے تو وہ مذہب کی آڑ پکڑ کر "دیندارانہ ظلم" پر اتر آیا اور عربوں کو اپنی قلمرو سے نکال باہر کیا۔ (۱) اس سے بڑھ کر تعجب خیز اور غیر معمولی کارنامہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مذہب ہی کی آڑ لے کر اس نے افریقہ پر دھاوا بولا۔ (۲) اطالیہ پر چڑھائی کی۔ (۳) اور آخر میں فرانس پر بھی حملہ کیا۔ (۴) وہ چونکہ برابر بڑے منصوبوں کی تیاری اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں لگا رہتا تھا۔ اس وجہ سے اس کی رعایا انتظار کی حالت میں رہتی اور تحسین و توصیف اور اس کے کارناموں کے نتائج پر غور و خوص میں لگی رہتی۔ کام ایسے تھے کہ ایک میں سے دوسرا برابر نکلتا چلا آتا' اور مخالفت کے لئے رعایا کو نہ وقت مل پاتا نہ موقع۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریاست میں اندرونی حکومت چلانے کے لئے بادشاہ ایسے طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو جاذب توجہ ہوں جیسا کہ میسر برنابو ملانو کی مثال سے ظاہر ہے۔ (۵) مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص غیر معمولی طور پر اچھا یا برا کام کرے تو بادشاہ اس کا صلہ یا پاداش دینے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرے جس کا خوب چرچا ہو سکے لیکن بادشاہ کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے کاموں سے اپنی عظمت اور نیکی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کرے۔ اسی طرح وہ بادشاہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو دوست ہو تو پکا دوست ہو اور دشمن ہو تو جانی دشمن۔

---

(۱) ۱۵۰۱ء کے لگ بھگ تمام عربوں اور یہودیوں کو خارج کر دیا گیا۔

(۲) ۱۵۰۹ء

(۳) نیپلس کو فتح کرنے کے لئے ۱۵۰۱ء

(۴) ۱۵۱۲ء میں دراصل نوارا پر حملہ کیا جس کی پشت پر فرانس تھا۔

(۵) ۱۳۵۴ء سے ۱۳۸۵ء تک اس نے اپنے بھائی گالیاتو کے ساتھ مل کر حکومت کی۔

یعنی یہ کہ کھلم کھلا ایک کا ساتھ دے اور دوسرے کی مخالفت کرے۔ یہ طریقہ غیر جانبداری سے کہیں زیادہ فائدہ مند ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ آپکے دو طاقتور پڑوسی آپس میں لڑ پڑتے ہیں اب ان میں سے جس کسی کی جیت ہوگی اس سے یا تو آپ خائف ہوں گے یا نہیں۔ دونوں صورتوں میں آپ کے لئے یہی مناسب ہو گا کہ ان میں سے ایک کا آپ علی الاعلان ساتھ دیں۔ آپ یہ نہ کریں گے تو جس سے آپ کو اندیشہ تھا وہ فاتح ہونے کے بعد آپ کی اچھی طرح خبر لے گا اور مفتوح آپ کی یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ آپ کے پاس ایک بھی معقول سبب یا بہانہ نہ ہو گا جس سے آپ اپنی مدافعت کر سکیں۔ اس لئے کہ فاتح ناقابل اعتبار دوستوں کو عزیز نہیں رکھا کرتا اور نہ ان کو جو آڑے وقت میں اس کے کام نہ آئیں۔ اور مفتوح پر آپ کا کیا احسان جب آپ کے ہاتھ میں تلوار ہو لیکن آپ اس کے دوش بدوش کھڑے نہ ہوں۔

جب اہل الطولیہ کے ایماء سے انیتوکس اہل رومہ کو خارج کرنے کے لئے یونان میں داخل ہوا تو اس نے اکائیوں کے پاس ایسے ایلچی بھیجے جن کے اہل رومہ سے دوستانہ تعلقات تھے اور ان کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین کی۔ برخلاف اس کے اہل رومہ نے یہ تاکید کی کہ وہ ان کی طرف سے جنگ میں شریک ہوں۔ جب یہ مسئلہ اکائیوں کی مجلس کے سامنے پیش ہوا تو انیتوکس کے سفیر نے پھر غیر جانبداری پر زور دیا۔ اس پر رومہ کے ایلچی نے یہ جواب دیا "تم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارے اختیار کرنے کے لئے غیر جانبداری سے بہتر اور فائدہ والی اور کوئی راہ نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ مفر طریق عمل ممکن نہیں۔ اس لئے کہ غیر جانبدار رہوں گے تو نہ کسی کے شکریہ کے مستحق ٹھہرو گے اور نہ تمہیں شہرت ہی نصیب ہوگی فاتح کے لئے بس مال غنیمت بن کر رہ جاؤ گے۔ ہمیشہ یہی ہو گا کہ جو تمہارا دوست نہ ہو گا وہ

تمہیں غیر جانبداری کی دعوت دے گا اور جو تمہارا دوست ہو گا وہ تم سے شرکت کا صاف اعلان کرنے کے لئے کہے گا۔ ارادے کے کچے بادشاہ فوری خطرے سے بچنے کے لئے اکثر غیر جانبداری کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور اس سے وہ اکثر تباہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہمت کر کے ایک یا دوسرے فریق کی طرف داری کا اعلان کر دو گے تو پھر جس فریق کا تم نے ساتھ دیا ہے اگر وہ جیت گیا تو وہ ہزار طاقتور ہو اور تم بالکل اس کے قبضہ قدرت میں ہو مگر وہ تمہارے زیر احسان ہو گا اور اتنا بے شرم کوئی کیا ہو گا کہ بین طور پر احسان فراموشی کر کے اسی کو تباہ و برباد کر دے جو ضرورت کے وقت اس کے کام آیا ہو۔ علاوہ بریں فتوحات کبھی بھی اتنی مکمل نہیں ہوا کرتیں کہ فاتح ہر طرح کے لحاظ خصوصاً" عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ سکے۔ برخلاف اس کے اگر تمہارے ساتھی کو شکست ہو تو وہ تمہارا ہمیشہ خیال کرے گا جہاں تک اس سے ہو سکے گا وہ تمہاری مدد میں دریغ نہیں کرے گا۔ تمہارا مستقبل اس کے مستقبل کے ساتھ منسلک ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ کبھی اس کا نصیب جاگے۔

دوسری صورت میں یعنی جب دونوں فریقوں کی طاقت اتنی محدود ہو کہ کوئی بھی جیتے تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہ ہو تب تو تمہارے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ایک کے شریک ہو جاؤ۔ اس لئے کہ ایک کی مدد سے تم دوسرے کو تباہ کر سکو گے۔ تمہارے ساتھی میں اگر ذرا بھی عقل ہو گی تو وہ دوسرے کو تباہ ہونے سے بچائے گا۔ اب اگر تمہارے ساتھی کو فتح ہوئی اور وہ تمہاری مدد سے فتح ہو بھی جائے گی تو وہ تمہارے قبضہ میں ہو گا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حملہ کرتے وقت بادشاہ کو خود اپنے سے زیادہ طاقتور فریق کا ساتھ کبھی نہیں دینا چاہیے۔ یہ اور بات ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجبوراً" اسے ایسا کرنا پڑے۔ اس لئے کہ اگر وہ جیت گیا تو تم اس کے پنجے میں

ہو گے۔ اور جہاں تک ہو سکے بادشاہ کو چاہیے کہ کسی دوسرے کے پنجے میں نہ پھنسے۔ گو اہل وینس اس دعوت اتحاد کو رد کر سکتے تھے مگر انہوں نے میلان کے ڈیوک کے خلاف فرانس کا ساتھ دیا اور اسی سے ان کی تباہی ہوئی۔ لیکن جب اتحاد کے سوا چارہ نہ ہو جیسا کہ اہل فلورنس کے ساتھ پیش آیا (۱) جب پاپائے رومہ اور ہسپانیہ نے اپنی فوجوں کے ساتھ لومباردی پر چڑھائی کی۔ غرض مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر بادشاہ کو ایک فریق کا ساتھ دینا لازمی ہے۔ پھر کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مملکت اپنے لئے ایسی راہ عمل منتخب کر سکتی ہے۔ جس میں کسی قسم کا خطرہ ہو ہی نہیں۔ وہ جو راہ بھی اختیار کرے اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے متعلق یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ انسانی معاملات میں اکثر یہی ہوا کرتا ہے کہ ایک فتنہ سے بچنے کے لئے انسان دوسرے فتنے میں جا پھنستا ہے۔ دانائی کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ انسان نقصانوں کو خوب تولے اور جو ہلکا نظر آئے اسے اچھا سمجھ کر قبول کر لے۔

علاوہ ازیں بادشاہ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو لیاقت کا قدردان ظاہر کرے۔ اور جو بھی کسی فن میں کمال رکھتے ہوں ان کی عزت افزائی کرے۔ اسے اپنی رعایا کی ہر طرح ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ چاہے تجارت ہو یا چاہے کوئی اور پیشہ ہر شخص اطمینان و سکون کے ساتھ اپنا کام کر سکے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی فرد اس ڈر سے اپنے مقبوضات کو بہتر بنانے کا خیال ترک کر دے کہ وہ اس کے ہاتھوں سے جاتے رہیں گے یا محصولوں کے ڈر سے نئی تجارت نہ شروع کرے۔ جو لوگ ان کاموں میں لگنا چاہیں اور جو اپنے شہر یا مملکت کی عظمت بڑھانے کے خواہاں ہوں ان پر بادشاہ کے انعام و اکرام کی بارش کرنی

---

(۱) لوئی دوازدہم اور مقدس لیگ کے مابین جو جنگ ہوئی اس میں اہل فلورنس نے غیر جانبداری اختیار کی نتیجہ یہ جمہوریت فلورنس کی تباہی اور لیدیچی کا دوبارہ بر سر اقتدار آنا۔

چاہیے۔ مناسب موقعوں پر بادشاہ کو جشنوں اور نمائشوں کے ذریعے قوم کی خاطر تواضع کرنی چاہیے اور چوں کہ تمام شہر برادریوں میں منقسم ہوتے ہیں اسے ان کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے اور کبھی کبھار ان میں شرکت کرنی چاہیے کہ اس کی خوش خلقی اور سخاوت سب پر ظاہر ہو۔ مگر اسے اپنے منصب کی شان ہمیشہ برقرار رکھنا چاہیے۔ایسا نہ ہو کہ اس میں ذرا سی بھی کمی واقع ہو۔

باب ۲۲

بادشاہوں کے معتمد!

وزیروں کا انتخاب بادشاہ کے لئے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ان کا بھلا یا برا ہونا بادشاہ کی مصلحت اندیشی پر موقوف ہے۔ چنانچہ بادشاہ کی سیرت اور دانائی کا صحیح اندازہ لگانے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگوں کو دیکھا جائے اگر وہ لائق بھی ہوں اور وفادار بھی تو سمجھنا چاہیے کہ بادشاہ ضرور عقل مند ہے۔ یوں کہ اس نے ان کی خوبی کو پہچانا اور ان کی وفاداری کو برقرار رکھا اور وزراء دوسری وضع کے ہوں تو پھر بادشاہ کے متعلق ہمارا فیصلہ مختلف ہونا لازی ہے۔ یوں کہ ان کے منتخب کرنے میں وہ پہلے ہی دھوکا کھا چکا ہے۔ جو کوئی انتونیو داؤنیا فرو (۱) کو شاہ سینا' پاولنو' پیترو چی کے ملازم کی حیثیت سے جانتا تھا اس کے لئے ممکن نہ تھا کہ جس دانائی کا ثبوت ماپد ہفو نے دینافرو کو ملازم رکھ کر دیا اس کا قائل نہ ہو۔ اس لئے کہ دماغ تین طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس میں خود سمجھنے کی صلاحیت ہو دوسرے وہ جو دوسرے کے سمجھنے سے فائدہ اٹھا سکے اور تیسرے وہ جو نہ تو خود سمجھ سکے اور نہ دوسروں کو دیکھ کر فائدہ اٹھا سکے۔ پہلی قسم کے کیا کہنے۔ دوسری بھی غنیمت ہے مگر تیسری بے کار ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ پالفو پہلی قسم سے نہیں تو دوسری قسم سے ضرور تھا' اس لئے کہ وہ دوسرے جو کچھ کہیں یا کریں اس کے بارے میں بادشاہ اچھے یا برے کی تمیز کر سکے۔ چاہے اس میں

---

(۱) مشہور معلم و قانون دان اور بعد میں وزیر۔ سال پیدائش ۱۴۵۹ء سال وفات ۱۵۳۰

جدت کا مادہ ذرا بھی نہ ہو تو کم از کم اپنے نوکر کی خوبیاں اور عیوب کو پہچان سکے گا' اور دوسرے کی اصلاح کر سکے گا اور ایسے آقا کو نوکر دھوکا نہ دے سکے گا اور ٹھیک ٹھیک خدمت انجام دے گا۔

کسی ملازم کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے اگر بادشاہ اسے اس کسوٹی پر پرکھے گا تو کبھی دھوکا نہ کھائے گا۔ جو ملازم بادشاہ کے مفاد سے زیادہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور اندرونی طور پر اپنے ذاتی مفاد کی فکر میں لگا رہتا ہے وہ کبھی بھی اچھا ملازم نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کسی صورت میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ جس کسی کے ذمہ مملکت کا انتظام ہو اسے اپنے آپ کو سرے سے بھلا دینا چاہیے اور ہر وقت بادشاہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کا دھیان ان معاملات کی طرف جانا ہی نہ چاہیے جو بادشاہ سے متعلق نہ ہوں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر اپنے نوکر کی ایمانداری برقرار رکھنا مقصود ہو تو بادشاہ کو چاہیے کہ اس کا ہر طرح خیال رکھے' اس کی عزت افزائی کرے' اس کو مالا مال کرے۔ اس کو اعزاز اور اس پر ہر طرح کے احسان کرے اور پریشانیوں میں اس کا شریک ہو۔ تاکہ ان سب باتوں سے اس پر یہ واضح ہو جائے کہ بغیر بادشاہ کے اس میں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کی صلاحیت نہیں ہے اس کی اس قدر عزت افزائی کرے کہ اس کو اور اعزاز کی ہوس نہ ہو پائے اور اسے اتنا مالا مال کر دے کہ مزید دولت کی خواہش اس کے دل میں نہ پیدا ہو اور اس کی غیر ہردلعزیزی اس کے دل میں تبدیلیوں کا خوف ڈال دے۔ جب بادشاہ اور اس کے ملازمین کے آپس کے تعلقات اس نہج پر قائم ہو جائیں گے تو وہ ایک دوسرے پر پورا اعتماد کر سکیں گے اور یہ صورت نہ ہوگی تو ضرور ایک نہ ایک کا انجام برا ہو گا۔

باب ۲۳

چاپلوسوں کو پاس نہ پھٹکنے دو

اس موضوع کے اہم پہلو کو میں نظرانداز نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے لئے یہ خطرہ ایسا ہے کہ اگر بادشاہ بہت محتاط اور ممیز نہ ہو تو اس سے بچ کر نکلنا بہت مشکل ہے۔ یہ خطرہ خوشامدیوں سے ہوتا ہے جن سے شاہی دربار بھرے پڑے ہیں اس لئے کہ لوگ اپنے امور میں ایسے مگن ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں انہیں کچھ ایسا مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ شاذ و نادر اس موذی مرض سے محفوظ رہتے ہیں اور حفاظت کی تدبیر کرتے ہیں تو ذلیل و خوار ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔ چاپلوسوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں کہ لوگوں کو اچھی طرح بتا دیا جائے کہ سچ بات سے بادشاہ خفا نہیں ہوتا مگر دقت یہ ہے کہ ہر شخص نے بادشاہ کو کھری کھری سنانا شروع کیں، تو بادشاہ کی وقعت خاک میں مل جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کو ایک تیسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ اپنی مملکت کے عقل مند لوگوں کو منتخب کرے اور انہیں اپنے سامنے سچ بولنے کی آزادی دے۔ یہ بھی صرف ان امور سے متعلق جن کے بارے میں وہ ان سے خود دریافت کرے۔ دوسرے امور پر وہ زبان کھولنے کے مجاز نہ ہوں۔ لیکن اسے چاہیے کہ ہر معاملے پر ان سے سوالات کرے۔ ان کی رائے کو اچھی طرح سنے اور بعد میں خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔

ان مشیروں کے ساتھ فرداً ''فرداً'' اور بہ حیثیت مجموعی ان کا رویہ ایسا ہو کہ ان میں سے ہر شخص بخوبی یہ جان لے کہ وہ جتنی آزادی کے ساتھ بادشاہ کے سامنے گفتگو کرے گا اسی قدر اسے ترجیح دی جائے گی۔ ان کے علاوہ کسی اور کی بات پر کان نہ دھرنا چاہیے۔ جو بات ایک دفعہ طے ہو جائے اس پر بادشاہ کا کاربند ہونا اور اپنے قصد پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا چاہیے' جو بادشاہ اس کے برخلاف عمل کرے گا وہ یا تو چاپلوسی کے ہاتھوں تباہ ہو گا یا تذبذب کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گا۔

اس موضوع پر ایک نئی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بابا لوچا نے جو موجودہ شہنشاہ ماکسی میلین کے کرتا دھرتا ہیں۔ مجھ سے شہنشاہ کے متعلق یوں کہا کہ وہ کسی کے ساتھ مشورہ نہیں کیا کرتا۔ مگر پھر بھی کسی معاملہ میں صرف اپنی رائے پر عمل نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ شہنشاہ اخفائے راز کا بڑا دلدادہ ہے وہ اپنے منصوبوں کا کسی سے ذکر نہیں کرتا اور نہ ان پر دوسروں کی رائے لیتا ہے۔ مگر جب ان پر عمل پیرا ہوتے وقت وہ دوسروں پر عیاں ہو جاتے ہیں تو اردگرد کے لوگ راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے ہیں اور چونکہ اس کی طبیعت اثر پذیر واقع ہوئی ہے وہ مجوزہ راہ سے مڑ جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ آج جو کچھ بناتا ہے کل بگاڑ دیتا ہے کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے اس کے فیصلوں پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

پس بادشاہ کو دوسروں سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے لیکن اس وقت جب وہ خود مشورہ کی ضرورت سمجھے نہ اس وقت جب دوسرے اسے ضروری خیال کریں۔ بلا طلب مشورہ دینے سے لوگوں کو روکنا چاہیے تاہم ضرورت ہے کہ بادشاہ برابر استفسار کیا کرے اور جوابات کو صبر کے ساتھ سنا کرے اور اگر اسے یہ پتہ چلے کہ کسی شخص نے اسے سچ سچ بات نہیں بتائی تو اس پر اپنے غصہ کا اظہار کرنا چاہیے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کسی بادشاہ کو یہ شہرت نصیب ہو کہ وہ بڑا دانا ہے تو اس کی وجہ یہ نہ ہوگی کہ خود اس میں کوئی خوبی ہے بلکہ یہ اس نے اپنے اردگرد عقل مند مشیر جمع کر رکھے ہیں۔ مگر یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ یہ کلیہ ایسا ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا اور جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے کہ جس بادشاہ میں خود عقل نہ ہوگی وہ ہمیشہ اچھے مشورے سے محروم رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے وہ تمام کے تمام امور مملکت کسی غیر معمولی طور پر ہوشیار شخص کے سپرد کر دے۔ ایسی صورت میں اسے ضرور اچھا مشورہ ملے گا مگر یہ سلسلہ بہت دنوں نہیں چلے گا اس لئے کہ ایسا مشیر چند روز میں اس کو بادشاہت سے ہی محروم کر دے گا۔

لیکن اگر کوئی ناتجربہ کار بادشاہ بہت سے مشیروں سے صلاح کرے گا تو اسے جو مشورے ملیں گے وہ بے جوڑ ہوں گے اور ان میں ربط پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔ یہ مشیر اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے گا اور بادشاہ نہ تو ان کی اصلاح کر سکے گا اور نہ ان کو ٹھیک سے بھانپ سکے گا۔ اس میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ لوگ دھوکہ دینے میں دریغ نہیں کریں گے یہ اور بات ہے کہ جبریہ طور پر ان کو ایمانداری پر قائم رکھا جائے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھے مشورے چاہے وہ جہاں سے آئیں' بادشاہ کی دانائی کا نتیجہ ہوتے ہیں بادشاہ کی دانائی اچھے مشوروں کی مرہون منت نہیں ہوا کرتی۔

باب ۲۴

شاہان اطالیہ اپنی حکومت کیوں کھو بیٹھے؟

متذکرہ بالا تجویزوں پر اچھی طرح عمل کرنے سے نیا بادشاہ آپ حکومت کو مستقل طور پر قائم کرسکے گا اس کی بادشاہی پرانی بھی ہوتی تب بھی اسے ایسے سلامتی اور استقلال نصیب نہ ہوتا۔ اس لئے کہ خاندانی بادشاہ کے مقابلہ میں نئے بادشاہ کے حرکات و سکنات کی بہت زیادہ جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اگر وہ اچھے سمجھے جاتے ہیں تو لوگوں کو توڑ لینے اور گردیدہ بنانے میں یہ نسلی قدامت سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ماضی کی نسبت حال میں زیادہ کشش ہوتی ہے اور جب لوگ حال کو خوش گوار پاتے ہیں تو اس سے پورا استفادہ کرتے ہیں اور کچھ نہیں طلب کرتے۔ یہی نہیں وہ بادشاہ کی مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے بشرطیکہ اس میں دوسرے نقائص نہ ہوں۔ بس ایک نئی بادشاہت قائم کرنے پھر اسے اچھے قوانین' اچھی فوجوں' اچھے حلیفوں اور اپنی مثال سے آراستہ و مستحکم کرنے کی وجہ سے اس کا دوگنا نام ہو گا۔ اسی طرح موروثی بادشاہ اپنی نالائقی سے بادشاہت کھو بیٹھے تو اس کی دوگنی رسوائی ہوگی۔

ہم اپنے زمانے کے ان رؤسا کو غور کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنھوں نے اپنی ریاستیں گنوا دیں مثلاً "شاہ نیپلس (۱) ڈیوک آف میلان (۲) وغیرہ تو ان میں مندرجہ ذیل نقائص نظر آتے ہیں۔ ایک غلطی تو سپاہ کے متعلق ہے جس کے اسباب پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاچکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یا تو قوم ان سے بدظن تھی یا اگر قوم خوش تھی تو شرفا کو وہ اپنے قابو میں نہ کر سکے۔ یہ خرابیاں نہ ہوں تو فوجوں کے ہوتے ہوئے مملکتیں مغلوب نہ ہو سکتیں۔

فلپ مقدونی (میری مراد سکندر اعظم کے باپ سے نہیں بلکہ اس فلپ سے ہے جس کو تیتس کوئن تیتس نے شکست دی۔ (۳) ایسے وسیع علاقوں کا مالک نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ اس پر حملہ کرنے والوں یعنی اہل رومہ اور یونان سے کیا جاسکے مگر آدمی جنگجو تھا قوم کو اپنی طرف کھینچنا اور شرفا کو اپنے ساتھ ملانا جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے کئی سال تک اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ (۴) اور گو آخر میں بعض شہر اس سے چھن گئے مگر اس کی بادشاہت برقرار رہی۔

پس اگر ایک عرصے کی حکومت کے بعد ہمارے بادشاہوں کے ساتھ ان کی مملکتیں نکل گئیں تو ان کے لئے مقدر کی شکایت بے جا ہے۔ اس کی ذمہ داری خود ان کی

---

(۱) فریڈرک اراگانی کے ہاتھ سے نیپلس کی حکومت ۱۵۰۶ء میں نکل گئی جب فرانسیسیوں اور ہسپانیوں نے مل کر حملہ کیا۔

(۲) لودی چو مورو سے میلان کی حکومت لوئز دوازدہم شاہ فرانس نے ۱۵۰۰ء میں چھین لی۔

(۳) دوسری مقدونی جنگ کی طرف اشارہ ہے۔ جب فلپ پنجم شاہ مقدونیہ کو ۱۹۷ ق م میں تیتس نے شکست دی۔

(۴) ۲۰۰ سے ۱۹۷ ق۔ م تک

کاہلی ہے۔ اس لئے کہ امن کے زمانے میں انہیں یہ بات کبھی نہ سوجھی کہ تغیرات بھی ممکن ہیں (انسانوں میں یہ عیب بہت عام ہے کہ کامل سکون ہو تو طوفانوں کا خیال نہیں آیا) چنانچہ جب برا وقت آیا تو ان بادشاہوں کو بجائے مدافعت کرنے کے بھاگنے کی سوجھی۔ ان کا خیال تھا کہ قوم فاتح کی حرکتوں سے تنگ آکر انہیں واپس بلالے گی۔ یہ رویہ اس صورت میں مناسب ہو سکتا ہے جب اور تدبیریں بیکار ثابت ہو چکی ہوں۔ مگر یہ بہت بے معنی بات ہے کہ اس پر بھروسہ کرکے اور کسی قسم کے انتظامات کئے ہی نہ جائیں کون ہے۔ جس کے دل میں اس خیال سے گرنے کی خواہش پیدا ہو کہ کوئی نہ کوئی اسے اٹھاکر کھڑا کر دے گا۔ اولاً تو یہ ضروری نہیں کہ قوم بادشاہ کو بحال کر دے اور اگر یہ ہو بھی تو اس میں بچاؤ کی صورت نہیں اس لئے کہ وہ نجات کس کام کی جو خود اپنے زور بازو سے حاصل نہ ہوئی ہو حفاظت کے وہی طریقے قابل اعتبار، یقینی اور دیرپا ہوتے ہیں جن کا دارومدار خود اپنی ذات اور اپنی طاقت پر ہو۔

✪ ❑ ✪

باب ۲۵

انسانی معاملات میں قسمت کو کتنا دخل ہے اور اس کا کاٹ کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟

میں اس سے ناواقف نہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہیں جن کی رائے میں دنیا کے تمام امور کچھ اس طرح قسمت اور خدا کی مرضی کے تابع ہیں کہ ان میں انسان اپنی عقل سے کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا اور وہ اس میں بالکل لاچار ہے۔ اس سبب سے یہ لوگ ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی سعی بے سود ہے اور ہر کام کو قسمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس رائے کو ہمارے زمانہ میں اور بھی تقویت پہنچی ہے وہ اس وجہ سے کہ حال میں اتنے بڑے بڑے تغیرات واقع ہوئے ہیں اور ابھی تک ہو رہے ہیں کہ جن کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی ان پر غور کرتا ہوں تو ایک حد تک میں بھی اس رائے کی طرف مائل ہو جاتا ہوں۔ مگر میرے خیال میں انسانی ارادہ کو اس طرح مسترد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر میرے خیال میں انسانی ارادہ کو اس طرح مسترد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انسانی اعمال میں سے نصف تو ایسے ہیں جن میں خود قسمت کا کارفرما ہے۔ باقی بچے نصف یا نصف سے کچھ کم سو وہ قسمت انسان پر چھوڑ دیتی ہے۔

قسمت کو میں ایک تند و تیز ندی کی مانند سمجھتا ہوں جس میں سیلاب آتا ہے تو چاروں طرف میدانوں میں پانی ہی پانی نظر آتا ہے اور ندی ہے کہ درختوں کو جڑ سے اکھاڑتی، مکانوں کو گراتی اور زمین کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔ کوئی اس کے سامنے نہیں ٹھہر پاتا اور اس کے غیض و غضب کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہی بنتی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ یہ سب درست سہی مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ چونکہ دریا کی فطرت کا یہی تقاضا ہے اس لئے جب اچھا موسم پلٹے تب بھی لوگ کوئی تدبیر نہ کریں، نہ بند تیار کرائیں نہ ٹھوکریں بنوائیں تاکہ جب ندی پھر چڑھنے لگے تو اس کا پانی نہروں میں سے ہوکر نکل جائے اور اس کا زور پہلے کی مانند غیر محدود اور خطرناک نہ ہونے پائے۔ یہی حال قسمت کا ہے وہ اپنا زور وہیں دکھاتی ہے جہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں اسے روکنے کے لئے بند اور ٹھوکریں تیار نہیں ہوتیں وہاں وہ بھی دریا کی طرح زور آزمائی کرتی ہے۔

اب اگر ملک اطالیہ پر نظر ڈالی جائے جو ان تغیرات کا مرکز اور محرک ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک کھلے میدان کی مانند ہے جس میں نہ کوئی بند ہے نہ پشتہ۔ جرمنی، ہسپانیہ اور فرانس کی مانند اگر یہاں بھی حفاظت کی تدبیریں کی جاتیں تو اس حملہ سے اتنی بڑی تبدیلیاں نہ ہوتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یورش ہی نہ ہوتی۔ قسمت سے مقابلہ کرنے کے بارے میں میں نے جو عام اصول اوپر بیان کئے اس پر اکتفا کرتا ہوں باقی رہے جزویات سو ان کے بارے میں خاص طور پر ایک بات کہنا ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ آج جو بادشاہ بامراد معلوم ہوتا ہے کل تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے مزاج یا سیرت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ میرے خیال میں ان سب اسباب کی بنا پر واقع ہوتا ہے جو پہلے مفصل طور پر بیان کئے جاچکے ہیں۔ یعنی یہ کہ جو بادشاہ صرف قسمت پر بھروسہ کرتا ہے وہ قسمت پلٹنے کی صورت میں کیسے تباہ نہ ہوں۔ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہی

بادشاہ بہت کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے افعال کو زمانے کے مزاج کے مطابق ڈھال سکتے ہیں' جو کوئی زمانے کے مزاج کا خیال نہیں رکھتا وہ ناکام رہتا ہے۔ اس لئے کہ مقصد تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی ناموری و دولت۔ مگر مختلف لوگ اسے مختلف طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک احتیاط برتتا ہے ایک جلد بازی کرتا ہے' ایک قوت سے کام نکالتا ہے ایک ہنرمندی سے' ایک صابر ہوتا ہے' ایک بے صبر۔ یہ سب اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں مگر حصول مقصد کے طریقوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دو محتاط افراد میں سے ایک کو کامیابی ہوتی ہے اور دوسرے کو ناکامی اسی طرح یہ بھی کہ دو شخص دو مختلف طریقوں سے یکساں طور پر کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً" ایک احتیاط سے دوسرا جلد بازی سے۔ یہ سب اس پر موقوف ہے کہ حصول مقصد کا طریقہ زمانہ کے مزاج کے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ یہی سبب ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ گو دو شخص مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں مگر ایک ہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے اور دو افراد ایک ہی طریقہ پر عمل پیرا ہوتے ہیں مگر ان میں سے ایک کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور دوسرے کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ قسمت کے تغیر کی بنیاد بھی اسی پر ہے ان لوگوں کو لیجئے جو احتیاط اور صبر سے کام لیتے ہیں۔ اگر زمانہ اور ماحول کا یہی تقاضا ہو گا کہ وہ احتیاط برتیں تو انہیں فروغ اور کامیابی نصیب ہو گی لیکن زمانہ اور ہوا کا رخ بدلنے کی صورت میں اگر وہ اپنا طریق کار نہ بدلیں گے تو ان کی خیریت نہ ہو گی۔ مگر دقت یہ ہے کہ عموماً" انسان ایسا چوکس نہیں ہوتا کہ زمانہ کے ساتھ خود بھی بدلے۔ ایک تو اس کی طبیعت کا رجحان ہے اس سے ہٹنا سہل کام نہیں اور دوسرے جو شخص ہمیشہ ایک ہی راستہ پر چلنے سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے اسے آسانی سے یہ یقین کیسے آئے کہ اس راہ کو چھوڑنے ہی میں اس کا فائدہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب جوکھوں میں پڑنے کے وقت ہو تب بھی محتاط شخص سے یہ نہیں بن پڑتا اور وہ یوں تباہ و

برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ خود بھی بدل جاتا ہے تو اس کی قسمت نہیں بدلتی۔

پوپ جولیس دوم کے تمام کاموں سے بے چینی عیاں ہے۔ زمانہ اور حالات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ وہ آندھی کی چال چلے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کامیاب ہوتا رہا۔ بلونا کے خلاف اس کی پہلی مہم پر نظر ڈالئے۔ میسر ژیووانی بنتی دول ابھی زندہ تھا۔ (۱) اہل وینس مہم کے طرف دار نہ تھے۔ یہی حال شاہ ہسپانیہ کا تھا شاہ فرانس سے اس موضوع پر گفت و شنید کا سلسلہ ابھی جاری تھا' ان سب باتوں کے باوجود حسب معمول جرانمردی اور جوش و خروش کے ساتھ میدان میں کود پڑا۔ اس کے اس اقدام پر ہسپانیہ اور اہل وینس خاموش رہے' اہل وینس خوف کی وجہ سے اور ہسپانیہ اس وجہ سے کہ اسے تمام قلمروئے نیپلس کو دوبارہ فتح کرنے کی آرزو تھی۔ (۲) برخلاف اس کے وہ شاہ فرانس کو اپنے ساتھ ملا سکا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ اس اقدام کو دیکھ چکا تھا اور اہل وینس کو نیچا دکھانے کے لئے پوپ سے دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ (۳) پھر اس کو کھلم کھلا ناراض کئے بغیر وہ کیسے فوج دینے سے انکار کرتا۔ چنانچہ جولیس نے اپنی جلد بازی سے وہ کام انجام دیئے جو دوسرا پوپ محض دانائی سے کبھی نہ انجام دے سکتا تھا۔ اس لئے کہ اگر وہ رومہ میں اس وقت تک بیٹھا رہتا جب تک تمام شرائط طے پا جاتے اور سب انتظامات مکمل ہو جاتے اور کوئی دوسرا پوپ ہوتا تو یہی کرتا تو اسے کبھی بھی کامیابی

---

(۱) ۱۵۰۶ء

(۲) ساحل کے ایک حصہ پر ۱۴۹۴ء سے اہل وینس کا قبضہ تھا جو ۱۵۰۹ء تک قائم رہا۔

(۳) ۱۵۰۸ء میں یہ اتحاد کمبرائی کی لیگ کی شکل میں معرض وجود میں آیا۔

نصیب نہ ہوتی۔ اس لئے کہ شاہ فرانس طرح طرح کے حیلے بہانے کرتا اور دو سرے بادشاہ ہزار قسم کا خوف دلاتے۔

اس کے اور کاموں کا میں ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ سب ایک سے تھے اور ان سب میں اسے کامیابی ہوتی رہی۔ عمر اس نے مختصر پائی اس وجہ سے ناکامی سے واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جاتے کہ احتیاط کا برتنا ضروری ہوتا تو اس کی تباہی لازمی تھی' اس لئے کہ وہ اس طریق عمل کو کیسے خیرباد کہتا جس کی طرف اس کا فطری طور پر میلان تھا۔

مختصر یہ کہ قسمت تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اور انسان غیر متبدل کامیابی اس وقت تک ہوتی ہے جب تک دونوں میں مطابقت رہے' اور جہاں دونوں میں تناقص ہوا پھر ناکامی ہی ناکامی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ احتیاط کرنے سے جان جوکھوں میں ڈالنا بہتر ہے۔ اس لئے کہ قسمت کو بس عورت سمجھئے۔ اسے قابو میں رکھنا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ اس کی زدوکوب کی جائے اور اس کے ساتھ سلوک میں سختی برتی جائے۔ اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں وہ اس پر حاوی ہو جاتے ہیں شرم و لحاظ سے کام نہیں چلتا۔ پس عورت کی طرح قسمت بھی نوجوان پر جان دیتی ہے۔ اس لئے کہ ان میں احتیاط کا مادہ کم ہوتا ہے۔ تندی و تیزی زیادہ ہوتی ہے اور وہ زیادہ بے باکی کے ساتھ اس پر حکومت کرتے ہیں۔

✪ ❑ ✪

باب ۲۶

اطالیہ کو وحشیوں سے آزاد کراؤ!

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس پر جب میں نے خوب غور کیا اور دل ہی دل میں سوچا کہ یہ گھڑی نئے بادشاہ کے لئے مبارک ہے یا نامبارک اور عقل مند اور نیک بادشاہ کے لئے اس کا موقع ہے یا نہیں کہ کسی نئے نظام کی بناء ڈال سکے جس سے اس کی بھی عزت بڑھے اور اس ملک کے باشندوں کا بھی بھلا ہو تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آج کل کتنی ہی باتیں نئے بادشاہ کے حق میں ہیں اور اس لحاظ سے شاید ہی کبھی کوئی زمانہ موجودہ زمانہ سے زیادہ موزوں گزرا ہو۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ حضرت موسیٰ کی قابلیت کے اظہار کے لئے بنی اسرائیل کا اہل مصر کی غلامی میں گرفتار ہونا اور سائرس کی روحانی عظمت کا پتہ لگانے کے لئے اہل فارس پر میدیوں کا جور و ستم ہونا' اور تھیسیوس کی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کے لئے اہل اثینینہ کا منتشر ہونا ضروری تھا تو پھر کسی اطالوی کی خوبی آشکارا ہونے کی صورت یہی تھی کہ اطالیہ بری طرح مصیبتوں کا شکار ہو جیسا کہ اب ہے' اور وہاں کے باشندے یہودیوں سے بد تر غلام' اہل فارس سے بڑھ کر مظلوم اور اہل اثینہ سے زیادہ منتشر ہوں' نہ ان کا کوئی سردار ہو' نہ وہاں کسی قسم کا نظام۔ اس پر بری طرح مار پڑے' اسے خوب لوٹا جائے' اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تخت و تاراج ہو اور ہر قسم کی مصیبت میں مبتلا ہو۔

حال ہی میں بعض ایسے افراد گزرے جن کے انداز سے یہ شبہ ہو چلا تھا کہ شاید خدا نے انہیں ہماری نجات کے لئے متعین کیا ہے۔ (۱) مگر بعد میں جب وہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچے تو قسمت نے انہیں ٹھکرا دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ اطالیہ کے جسم میں جیسے جان ہے ہی نہیں۔ وہ اس کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اس کے مرض کا علاج کرے' لمبارڈی کی تباہی اور لوٹ کھسوٹ کو بند کرے' تسکانی کی دھوکہ بازیوں اور زیادتیوں کا خاتمہ کرے اور ان زخموں کی مرہم پٹی کرے جو مدتوں سے بگڑ رہے ہیں۔ وہ کس طرح خدا سے التجا کر رہا ہے کہ اے مالک! تو کسی ایسے شخص کو بھیج جو ان مصیبتوں اور وحشیانہ زور و ستم سے چھٹکارا دلائے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے ایک جھنڈے تلے جمع ہونے پر آمادہ اور راضی ہے۔ بشرطیکہ کوئی جھنڈا بلند کرنے والا ہو۔ میں ہزار نظر دوڑاتا ہوں مگر سوائے آپ کے عالی مرتبہ خاندان کے (جو اپنے اوصاف حمیدہ اور اقبال مندی کی وجہ سے ممتاز ہے جس سے خدا خوش اور جس پر کلیسا مہربان ہے اور جسے اس وقت کلیسا کی قیادت کا شرف حاصل ہے۔ (۲) اور کوئی نجات دہندہ دکھائی نہیں پڑتا۔ یہ کام کچھ کٹھن بھی نہیں ہے۔ آپ ذرا ان لوگوں کے کارناموں اور زندگیوں پر نظر ڈالئے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ بہت عظیم الشان اور غیر معمولی انسان تھے مگر تھے تو انسان ہی۔ انہیں جیسے مواقع ملے۔ ویسے مواقع آج بھی ہیں۔ ان کی مہمیں نہ تو موجودہ مہم سے زیادہ نیک تھیں اور نہ زیادہ سہل۔ خدا بھی آپ سے زیادہ ان پر مہربان نہ تھا۔

---

(۱) مراد ہے غالباً "سیزارے بورژیا۔

(۲) ژیوواتی میدیچی لورنزو کا دوسرا بیٹا ۱۵۱۳ء سے لیو دہم کے نام سے پاپائے روما بنا۔

ہمارا مقصد انصاف پر مبنی ہے اس لئے کہ جو جنگ ضروری ہو اس کی بناء انصاف پر ہے۔ اور جن کی اسلحہ سے ساری امیدیں وابستہ ہوں وہ متبرک ہیں۔ آج پوری قوم اس مہم میں شریک ہونے کے لئے بے تاب ہے اور جب بے تابی کا یہ عالم ہو تو زیادہ مشکلات پیش نہیں آسکتیں۔ شرط اتنی ہے کہ آپ ان لوگوں کے نقش قدم پر چلیں جن کو میں نے آپ کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ اس وقت آپ پر خدا کے الطاف و کرم کی کتنی صاف نشانیاں نظر آرہی ہیں۔ سمندر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ بادل کا ایک ٹکڑا راستہ دکھاتا چلا گیا ہے' چٹانوں سے پانی پھوٹ پڑا' من و سلویٰ کی بارش ہو رہی ہے غرض ہر چیز آپ کا رتبہ بڑھانے میں مد معلوم ہوتی ہے باقی جو کچھ ہے وہ خود آپ کے کرنے کا ہے۔ خدا خود کاموں کو تکمیل تک نہیں پہنچاتا اس لئے کہ ہم کو ارادے کی آزادی سے اور حصول اور ناموری میں شرکت سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جن اطالیوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان میں کوئی بھی وہ کام انجام نہ دے سکا جس کی آپ کے خاندان ذی شان سے توقع کی جاتی ہے۔ اطالیہ میں جو انقلاب ہوئے اور جو جنگیں لڑی گئیں ان سے اگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سپاہیانہ اوصاف اس ملک سے رخصت ہو چکے ہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم نظام اچھا نہ تھا اور ہم میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی جگہ کو نسا نیا نظام قائم کیا جائے۔ جب کوئی شخص نیا نیا بادشاہ بنا ہو تو کسی چیز سے اس کے مرتبہ میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا جتنا کہ نئے قانون جاری کرنے اور نئے ادارے قائم کرنے سے انہیں کاموں سے بشرطیکہ ان کی بنیادیں مستحکم ہوں اور ان میں خاصہ وزن ہو' بادشاہ کی تعریف و تحسین ہوتی ہے اور اس کا وقار بڑھتا ہے اور اطالیہ میں ہر طرح کی اصلاح کے لئے مواقع کی کمی نہیں۔

یہاں کے لوگوں میں جسمانی قوت کی نہیں' دماغی قوت کی کمی ہے ذرا کسی مبارزہ یا دست بدست لڑائی پر نظر ڈالئے' قوت' سبکدستی اور پھرتی میں اہل اطالیہ دوسرں سے کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی فوجیں نکمّی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ رہبروں کی کمی ہے جو واقعی لائق ہیں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہے۔ ایسے بھی ہیں جو اپنے تئیں نہ معلوم کیا سمجھتے ہیں اس لئے کہ اس سے پہلے بہت ممتاز رہبر ہوئے ہی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس سال (۱) سے جنگ و جدل کے دوران میں جب کبھی کوئی فوج اطالیوں پر مشتمل تھی بالکل نااہل ثابت ہوئی اس کا پہلا ثبوت ال تارو (۲) میں ملتا ہے۔ پھر اسکندریہ (۳) کاپوا (۴)' جنووا (5)' وائیلا (۶)' بلونا (۷) اور مستری (۸) ہیں۔

پس اگر آپ کا عالی مرتبہ خاندان غیر معمولی افراد کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے جو اپنے ملک کی نجات کا باعث ہوئے تو سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ آپ کی اپنی

---

(۱) یعنی چارلس ہشتم کی اطالوی مہم ۱۴۹۴ء کے بعد سے۔

(۲) ۱۴۹۵ء جب فرانسیسیوں کو وینس کی لیگ پر فتح حاصل ہوئی۔

(۳) ۱۴۹۹ء الے ساندریہ کی تباہی لوئز دوازدہم کے ہاتھوں۔

(۴) جب فرانسیسیوں نے نیپلس کے ساتھ جنگ کر کے کلوپا پر قبضہ کیا۔

(5) ۱۵۰۷ء لوئز دوازدہم کا جنووا پر قبضہ۔

(۶) ۱۵۰۹ء لوئز دوازدہم کی فتح اہل وینس پر۔

(۷) ۱۵۱۱ء فرانس کی جنگ یورپ اور اہل وینس کی متحدہ طاقت سے۔

(۸) ۱۵۱۳ء اس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو اہل وینس اور لیگ (پوپ شہنشاہ ہسپانیہ اور مائی لانڈ) کے مابین ہوئی۔

فوج ہو کہ یہی ہر بڑے کام کی صحیح بنیاد ہے۔اس لئے کہ اپنی فوج غیر فوج سے لازمی طور پر زیادہ وفادار' زیادہ قابل اعتبار اور بہتر ہوگی۔ اور اگر فردا" فردا" آپ کے سپاہی اچھے ہوں گے تو مجموعی طور پر اور بھی اچھے ہوں گے۔ خصوصا" جب وہ دیکھیں گے کہ وہ خود بادشاہ کے زیر کمان ہیں۔ بادشاہ ان کی عزت کرتا ہے اور اپنے پاس سے ان کا خرچ دیتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کی فوج تیار کرنا ضروری ہے تاکہ آپ کی مدافعت میں اطالوی' اپنی شجاعت سے بدیسیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

سوستانی اور ہسپانوی پیادہ افواج ایسی ہیں کہ ان کا مقابلہ بہت مشکل خیال کیا جاتا ہے۔ مگر دونوں میں ایک خرابی ہے جس کی وجہ سے دوسری فوج نہ صرف ان کا مقابلہ کر سکتی ہے بلکہ انہیں نیچا دکھا سکتی ہے ہسپانوی فوجیں رسالے کے مقابلے میں تاب نہ لا سکتیں اور اگر دست بدست جنگ کی نوبت آجائے تو سوستانی فوجیں پلٹنوں سے بہت ڈرتی ہیں۔ گو دوسرے دعوے کا پورا ثبوت نہیں دیا جا سکتا' لیکن اس کی سچائی کا تھوڑا بہت اندازہ جنگ راوینہ (۱) سے ہو سکتا ہے۔ جہاں ہسپانوی پیادہ فوج کا مقابلہ جرمن دستوں سے ہوا اور جن کی تدابیر جنگ وہی تھیں جو سوستانیوں کی ہوتی ہیں۔ جب ہسپانوی سپاہی جسم کی پھرتی اور اپنے سپروں کی مدد سے ایک دفعہ جرمنوں کے نیزوں کی زد سے بچ کر نکل گئے تو پھر نئے سرے سے حملہ آور ہوئے اور جرمن تھے کہ ہکے بکے رہ گئے اگر سوار فوج بہت تیزی سے موقع پر نہ آن دھمکتی تو جرمنوں کا خاتمہ تھا ہمیں چونکہ ان دونوں پیادہ فوجوں کے نقائص کا پتہ ہے لہٰذا اس کا امکان ہے کہ ایک نئی قسم کی فوج تیار کریں جو رسالوں کا مقابلہ بھی کر سکے اور پیادہ فوج سے بھی خائف نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم بالکل نئی قسم کی فوج ایجاد کریں۔ پرانے انداز کی

---

(۱) ۱۵۱۳ء

فوجوں میں صرف تھوڑی سی تبدیلی کرنی ہوگی اور یہی اصلاحیں ہیں جن سے نئے بادشاہ کا نام روشن اور اس کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔

لہٰذا اس موقع کو ہاتھ سے نہ نکلنے دینا چاہیے کہ اطالیہ اپنی رہائی دلانے والے کا بالآخر درشن کرے۔ اس وقت جو کیفیت ہوگی اس کا نقشہ الفاظ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ جہاں بیرونیوں کی ریل پیل رہی ہے وہاں اس کا کس شوق سے خیر مقدم ہو گا۔ کس شدت کے ساتھ انتقام کی آگ بھڑکے گی۔ کیسا محکم یقین ہو گا' کیسی جاں نثاری ہوگی' اور آنسو ہوں گے کہ بس اڈے چلے آئیں گے۔ کون ہے جو اسے خوش آمدید نہ کہے گا؟ کس کو اس کی اطاعت سے گریز کی مجال ہوگی؟ کس کا حسد اس کی راہ میں حائل ہو سکے گا؟ اطالیہ کا کون ایسا فرزند ہو گا جو اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے گا؟ اس وحشیانہ زور و ستم کی بدبو ایسی ہے کہ سب کے نتھنے پھٹے جاتے ہیں۔ یہ نیک کام آپ ہی کے نامی خاندان کے کرنے کا ہے۔ ہمت کیجئے اور امید کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ یہاں تک کہ آپ کے جھنڈے تلے اس ملک کے پھر دن پھریں اور آپ کے زیر سرپرستی پٹرارک کا یہ قول پورا ہو۔

جس گھڑی مردانگی نے ہاتھ میں تلوار لی
وحشیان خیرہ سر ڈھونڈے نہ پائیں گے مفر
عہد پارینہ کے جنگی کارناموں کے سبب
آج بھی اٹلی کے سینے میں فروزاں ہیں شرر
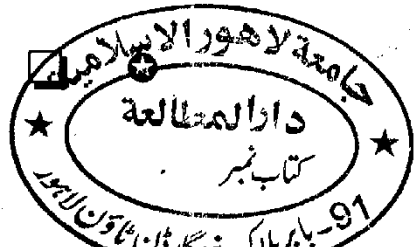
تاریخ و سوانح

صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈلیم
سلیمان عالی شان	ہیرلڈلیم
ہینی بال	ہیرلڈلیم
بابر	ہیرلڈلیم
نور محل	ہیرلڈلیم
چنگیز خان	ہیرلڈلیم
سکندر اعظم	ہیرلڈلیم
امیر تیمور	ہیرلڈلیم
تاتاریوں کی یلغار	ہیرلڈلیم
قسطنطنیہ	ہیرلڈلیم
داستان نپولین	ا۔ یمیل لڈوگ
عظیم کتابیں	رابرٹ بی ڈاؤنز
عظیم لوگ	اگن لارسن
عظیم سائنس دان	لن اور گرے پول
پنجاب کی ذاتیں	ڈینزل ابٹسن
مسلم افکار	راج موہن گاندھی
ایک تھی سارا	امرتا پریتم
تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار	محمد فاروق قریشی
انسانی حقوق کی تحریک	روبینہ سہگل
نامور ادیبوں اور شاعروں کا بچپن	شفیع عقیل